

قصہ

ایمان خان

مت پوچھ فکرِ زیست کی غارت گری کا حال

احساس برف برف تھا مگر بھڑک اٹھا۔۔۔۔۔

جھلملاتی روشنیوں والی اس بڑی سی کوٹھی میں عجیب سی چھل پہل تھی آسمان پہ چاند اپنی پوری

آب و تاب سے چمک رہا تھا اور زمین پہ وہ رنگ برنگے چمکیلے کپڑوں والی پریاں۔۔۔۔۔ جو

جھوم جھوم کہ زمین کو لرزا رہی تھی۔۔۔۔۔ ان کے پیروں کی حرکت نے کسی شکنجے کی طرح

زمین کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور سامنے بیٹھے ہوئے وہ مرد جھوم جھوم کے ان کی اس

محفل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔۔

یہاں ہر طرف جیسے روشنیاں بکھری ہوئی تھیں یہاں کبھی رات نہیں ہوتی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا جسم کی ان سوداگر عورتوں کے دلوں میں شام کے اتنے گہرے اندھیرے تھے جن اندھیروں نے خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا تھا ارمانوں کی قبر بنادی تھی اور خوابوں کی کرچیاں ان کے دل میں کھب گئی تھیں وہ جیسے کھپتلیاں تھیں جس کی ڈور ان کی ضرورتوں کے ہاتھ میں تھی کچھ کی تو ضرورتیں بھی مردہ تھیں وہ زندگی کے دن گن رہی تھیں کچھ دو روزہ محبت کا قرض چکانے آئی تھیں۔۔۔۔۔ یہاں ہر عورت اپنے گناہوں کا قرض ہی چکانے آئی تھی سوائے اس ایک لڑکی کے جو اس چمکیلے پردے سے جھانک کر قص دیکھنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔۔۔۔۔

رانی جو کہ اس کوٹھے کی ابھرتی ہوئی طوائف تھی۔۔۔۔۔ لہک لہک کہ اپنے حسن کہ جلوے بکھیر رہی تھی اور سامنے بیٹھے نشے میں دھت مرد اس منظر میں اس قدر غرق تھے کہ انہیں ارد گرد کی ہوش نہیں تھی

رانی پہ نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی

اور وہ لپچائی ہوئی نظروں سے ان نوٹوں کو دیکھ رہی تھی

جب اس کے کندھے سے پکڑ کہ اسے کسی نے کھڑکی سے پیچھے ہٹایا تھا۔۔۔۔

اور وہ پیچھے مڑے بغیر بھی جان چکی تھی کہ وہ ہستی کون ہے

وہ ایک دفعہ پھر پکڑی جا چکی تھی۔۔۔۔

اس لیے آنکھیں مینچے پیچھے مڑی تھی۔۔۔۔

سامنے چہرے پہ ناراضگی سجائے اس کی ماں کھڑی تھی

”آپ پھر یہاں کھڑی ہو آپ کو لاکھ دفعہ منع کیا ہے زرا پاش اس کھڑکی میں مت کھڑی ہوا

کریں آپ پہ کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ وہاں باہر بیٹھے کسی مرد کی آپ پہ نظر

پڑ گئی نا تو وہ کتے کی طرح پیچھے پڑ جائے گا۔۔۔۔۔ میں پھر آپ کو کس طرح بچاؤں گی

وہ اسے بری طرح جھڑک رہی تھی

اور وہ سر جھکائے کھڑی تھی

”بیس سالوں سے ان کے منته تر لے کیے ہیں پاؤں بھی دھو دھو کر پیئے ہیں کہ وہ آپ کو اس

کام کی طرف نہ لائی ہیں آپ پتہ نہیں کیوں میری محنت اکارت کرنے پہ تلی ہو۔۔۔۔“

ان کی آنکھیں جھلملانے لگی

وہ جانتی تھی وہ اس کی ماں ہیں اس پہ ٹھیک طرح سے غصہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔

وہ اپنی ماں کی تمام قربانیوں سے واقف تھی

کوٹھے میں رہ کہ کسی جوان لڑکی کی عزت محفوظ رکھنا۔۔۔۔۔ کتنا مشکل کام تھا وہ جانتی تھی

”اسی لیے آگے بڑھ کہ انہیں گلے لگایا تھا

”اماں جان معذرت۔۔۔۔۔ خدا کی قسم ہم بس رقص دیکھ رہے تھے آپ کو تو پتہ ہے ہم رقص

دیکھنے کہ کتنے شوقین ہیں۔۔۔۔۔ بس اسی لیے ہمیں معاف کر دیں۔۔۔۔۔ ہم آئی ندہ آپ کو

دکھ نہیں پہچائی ہیں گے“.....

وہ کان پکڑ کہ شرمندگی سے ان سے معذرت کر رہی تھی۔۔۔۔۔

زری اس رقص کی خواہش مت کریں۔۔۔۔۔ یہ رقص ہمارے ضمیر کو سلا دیتا ہے ہمیں بے
مول کر دیتا ہے یہ بے مول رقص ہماری قیمت لگاتا ہے ہمیں کھپتلی بناتا ہے آپ تو خوش
قسمت ہیں کہ اللہ نے اس کوٹھے میں بھی آپ کو پاکیزہ رکھا لوگوں کی گندی نظروں سے
بچایا۔۔۔۔۔

وہ اونچے تاج بھرے پلنگ پہ بیٹھ کہ افسوس اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔
اور وہ بھورے بالوں والی لڑکی یہ سوچ رہی تھی کہ کوٹھا اتنی بری جگہ بھی نہیں ہے پھر یہ کیوں
بدنام ہے۔۔۔۔۔ اور یہ رقص۔۔۔۔۔ کتنا خوبصورت ہے تو پھر اس کی ماں کیوں اس رقص
کے خلاف ہے۔۔۔۔۔“

بحث کا ارادہ ملتوی کر کے وہ وہی خاموشی سے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”جہاں آرا بیگم ایک نظر اپنی معصوم بیٹی کو دیکھ کہ رہ گئی۔۔۔۔۔“

وہ کب تک زرپاش کو اس گندی جگہ پہ محفوظ رکھ سکیں گی۔۔۔۔۔

یہ سوچیں ایک دفعہ پھر انہیں پریشان کرنے لگی۔۔۔۔۔



اب میرے عیب تو مت گنواؤں

مجھے احساس ہے براہوں میں

صبح کا سورج۔۔۔۔۔ اس بڑی حویلی پہ اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا صبح کب کی ہو چکی

تھی اب تو گھروں سے دن کے کھانے کی مہک آرہی تھی۔۔۔۔۔

یہ سادہ لوح لوگ اپنے کاموں کو دل و جاں سے انجام دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”ایسے میں بڑی حویلی کے اس عالیشان کمرے میں وہ بکھرے بالوں والا خوبرونو جوان بے

زاری چہرے پہ سجائے پلنگ سے نیچے اتر رہا تھا۔۔۔۔۔

ملازم تیسری دفعہ دستک دے کہ جاچکا تھا لیکن۔۔۔۔۔ وہ اپنی مرضی سے ہی جاگا تھا۔۔۔۔۔

اب وہ آئی نے کے سامنے کھڑا۔۔۔۔۔ بال درست کر رہا تھا۔۔۔۔۔
چوڑی پیشانی۔۔۔۔۔ کالے سیاہ بال جو کنگی سے پیچھے کی طرف سیٹ کر رکھے
تھے۔۔۔۔۔ خوبصورت شہد رنگ آنکھیں۔۔۔۔۔ مغرور ناک۔۔۔۔۔ اور دائیں
گال پہ پڑاڈمپل۔۔۔۔۔ اس کی خوب و شخصیت میں اضافہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔
سفید کاٹن کی قمیض شلوار واسکٹ پہنے وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے کی طرف گیا جہاں
سامنے بڑے صوفے پہ میر داد خان بیٹھے تھے۔۔۔۔۔
ایک اچنی نظر اس پہ ڈالی۔۔۔۔۔
ملازمہ کو چائے کی ہدایت دیتے ہوئے وہ میر داد خان کے قریب بیٹھ گیا۔۔۔۔۔
حیرت کی بات تھی کہ آج وہ اپنے لاڈلے پوتے سے بات نہیں کر رہے تھے۔۔۔۔۔
اور وجہ وہ جانتا تھا
”خان۔۔۔۔۔ لگتا ہے رات کو تاخیر سے واپس آئے ہیں آپ۔۔۔۔۔“؟

انہوں نے ذو معنی لہجے میں کہا۔۔۔۔۔

وہ چونکا

”جی بس ڈیرے پہ تھوڑا کام تھا۔۔۔۔۔“

اس نے سرسری کہا۔۔۔۔۔

”پوچھ سکتا ہوں کیا کام تھا آپ کو۔۔۔۔۔؟“

”دادا جی جب آپ کو علم ہو ہی گیا ہے تو۔۔۔۔۔ آپ مجھے کیوں کرید رہے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ بری طرح چڑ گیا تھا۔۔۔۔۔

”کیا آپ نے ملک حق نواز کے بیٹے پہ صرف ایک گھوڑے کی وجہ سے فائی رنگ کی

ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ ابھی تک بے یقین تھے

اس لیے سختی سے بولے۔۔۔۔۔

”نہیں اس کی بد تمیزی کی وجہ سے“

اس نے بھی دو بد و جواب دیا۔۔۔۔۔

”وہاج وہاج آپ کو ہماری ایک بات سمجھ نہیں آتی کیا۔۔۔۔۔ کب آپ یہ ضد چھوڑیں گے

اپنی۔۔۔۔۔“؟ یہ گاؤں کے لوگ ہمارے ملازم نہیں ہیں وہاج محبت پیار کے بھوکے

ہیں۔۔۔۔۔ سختی برداشت نہیں کرتے ہماری عزت کرتے ہیں آپ کی ان غلطیوں کا حمیازہ ہم

کتنی بار بھگت چکے ہیں۔۔۔۔۔ اب کی بار پھر بگھتے گے۔۔۔۔۔“

وہ بہت پریشان نظر آرہے تھے اس لیے اپنے لاڈلے پوتے کو پیار سے سمجھا رہے تھے

جسے وہ لا پرواہی سے سن رہا تھا۔۔۔۔۔

ان کی پوری بات سن کہ وہ تھوڑا ان کے قریب ہوا۔۔۔۔۔

آنکھوں میں تپش لے کہ انھیں دیکھنے لگا۔۔۔۔۔

”خان جی۔۔۔۔۔ یہاں لوگ ہماری نہیں۔۔۔۔۔ نوٹوں کی عزت کرتے ہیں یہ دنیا لوگوں کی نہیں نوٹوں کی پجاری ہے اگر آپ کے پاس یہ دولت نہ ہوتی تو۔۔۔۔۔ آپ بس نام کہ خان رہ جاتے۔۔۔۔۔“

وہ تمسخرانہ ہنسا۔۔۔۔۔

وہ سفید بالوں والا شخص منہ کھولے اپنے پوتے کی باتیں سن رہے تھے۔۔۔۔۔

وہ اس کی اس حد تک صاف گوئی سے بہت تنگ تھے۔۔۔۔۔ اور آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی

اپنی غلطی وہ شروع ہی سے نہیں مانتا تھا۔۔۔۔۔ تو آج کیوں مانتا

ہمیشہ کی طرح ان کا منہ بند کروا کہ ٹیبل پہ پڑی انہی کی گاڑی کی چابیاں اٹھا کہ باہر دروازے کی طرف بڑھ گیا

وہ جانتے تھے وہ اب دو تین دنوں بعد ہی گھر واپس آئے گا۔۔۔۔۔

وہ بس سر جھٹک کہ رہ گئے۔۔۔۔



کچھ اس وجہ سے بھی مشہور ہم زیادہ ہوئے۔۔۔

کہ صرف عیب ہی گنوائے گئے ہمارے

لہلہاتی کھیتوں کو چیرتی ہوئی یہ گاڑی۔۔۔۔ اس کچے پکے سڑک پہ رواں دواں تھی وہ بے

دھیانی سے گاڑی ڈرائی یو کرتے ساتھ ہی فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا

سپاٹ چہرہ لیے جیسے کسی کو ہدایت دے رہا تھا۔۔۔۔۔

”ہاں نگار بیگم کوٹھے پہ جو بھی طوائی فیں سب سے اچھا رقص کرتی ہیں بس انہیں بھیج

دیجیئے۔۔۔۔۔“

وہ ایک ہاتھ اسٹیرنگ پہ رکھ کہ جیسے حکم دے رہا تھا

”بس آج کی شام کے لیے۔۔۔۔۔“

دور اس جھلملاتی روشنیوں سے مزین اس کوٹھے میں نگار بیگم اپنی ازلی شان و شوکت

لیے۔۔۔۔۔ لبھانے والے انداز میں باتوں کا جواب دے رہی تھی۔۔۔۔۔

”ارے خان جی۔۔۔۔۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر ایسی لڑکیاں بھیجوں گی کہ زمین پہ رقص کہ

ایسے جلوے بکھیرے گی۔۔۔۔۔ کہ سب لوگ عیش عیش کراٹھیں گے۔۔۔۔۔“

وہ ایک ہاتھ سے فون درست کرتی منہ سے پان تھوکتے ہوئے چمک کر بولی۔۔۔۔۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے بے زاری سے ان کے تعریفوں کے پل سنے تھے۔۔۔۔۔“؟

خود تو وہی ہونگے نا آپ رات میں۔۔۔۔۔“؟

نگار بیگم نے تفتیشی لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں میں کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا ہوں آتے آتے رات ہو جائے گی آپ لڑکیوں

کو بھیج دیجیئے گا۔۔۔۔۔ میرے دوست وہی ہونگے۔۔۔۔۔“

وہی ازلی مغرور لہجہ۔۔۔۔۔

نگار بیگم نے براسا منہ بنا کہ فون کو دیکھا۔۔۔۔

پھر مصنوعی خوشامد لہجے میں سموتے ہوئے رضامندی کا اظہار کر ڈالا۔۔۔۔

”اب وہ جہاں آرا کو آوازیں دے رہی تھی۔۔۔۔“

جہاں آرا بوتل میں سے نکلے جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔۔۔۔

”جی نگار بیگم حکم کیجیئے۔۔۔۔“

ان کے سامنے چمکیلی ساڑھی زیب تن کیے۔۔۔۔ دہلی پتلی لمبے بالوں والی تیکھے نقوش والی

عورت طابعداری سے کھڑی تھی۔۔۔۔

انہوں نے نخوت سے اسے دیکھا تھا

لڑکیوں کو تیار کرو۔۔۔۔

رات کو خان جی کی حویلی میں رقص کے لیے جانا ہے

تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے وہ رخ موڑ گئی۔۔۔۔

اور وہ سر ہلا کہ باہر نکل گئی۔۔۔۔

وہ ان کی ناراضگی سمجھتی تھی

لیکن جو وہ چاہتی تھی ایسا ہونا ناممکن تھا۔۔۔۔

ساری عمر کی خدمت کا انہیں یہ صلہ مل رہا تھا یہی سوچ کہ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔۔۔۔

آنسو چھپاتی۔۔۔۔ اب وہ لڑکیوں کو ہدایت کر رہی تھی جو بہت طاعنہ داری سے وہ سن رہی تھی
دور اس گاؤں میں اس لڑکے نے گاڑی کی سپیڈ بڑھادی تھی۔۔۔۔



دیکھانہ کسی نے بھی پلٹ کہ میری طرف

محسن میں بکھرے ہوئے شیشوں کی ردا تھا

چمچاتی آنکھوں کو خیرہ کرتی روشنیوں سے مزین اس کوٹھے میں تیاریاں اپنے عروج پہ
تھی۔۔۔۔۔ ساری لڑکیاں دل و جاں سے تیاریوں میں مشغول تھی۔۔۔۔۔ خان حویلی جانے
کاسب کے دل میں ارمان تھا۔۔۔۔۔

ایسے میں صرف وہ پلنگ پہ گھٹنوں کو باہم ملائے۔۔۔۔۔ گرد ہاتھوں کا دائی رہ
بنائے۔۔۔۔۔ تھوڑی ٹکائے منہ پھلا کہ بیٹھی تھی۔۔۔۔۔

شیشے کے سامنے کھڑی میک اپ کو آخری ٹچ دیتی جہاں آرا نے وہی شیشے میں اپنے پیچھے بیٹھی
زرپاش کو ایک نظر دیکھا۔۔۔۔۔

پھر ایک ادا سے پیچھے مڑی۔۔۔۔۔

”کب تک ناراض رہنے کا اور بھوک ہڑتال کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں آپ زری۔۔۔۔۔“

وہ وہ بالوں کو سینے پہ پھیلائے۔۔۔۔۔ اس کے بالکل پاس پلنگ پہ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”جب تک آپ ہماری بات نہیں مان لیتی ہے۔۔۔۔۔“

اس نے نروٹھے لہجے میں کہا۔۔۔۔

”ضد مت کریں زرپاش جو آپ چاہتی ہیں ویسا ممکن نہیں ہے۔۔۔“؟

انہوں نے سختی سے کہا تھا۔۔۔۔

”کیوں ممکن نہیں ہے اماں جان۔۔۔۔ ہم بھی انسان ہیں ہمارا بھی دل چاہتا ہے۔۔۔۔۔ کہیں

جانے کو۔۔۔۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ باہر کی دنیا کیسی ہے۔۔۔۔۔ بس کالے شیشوں والی

گاڑی میں ہمیں سکول اور کالج بھیجا جاتا تھا اسی میں واپس لایا جاتا تھا آپ بتائیں ہم انسان

نہیں ہیں کیا؟“ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کھلی فضا میں سانس لیں باہر کی دنیا دیکھیں اور کون سا اکیلا

جانے کی ضد کر رہے ہیں آپ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔۔۔۔“

وہ یاسیت سے کہتے ہوئے اب باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی

اسے اپنی ماں کی کمزوری پتہ تھی اور وہ یہی حربہ آزماتی تھی۔۔۔۔۔

آج بھی اس کا تیر نشانہ پہ جا کے لگا تھا

وہ تڑپ اٹھی تھی۔۔۔۔

”اچھا آپ روئیے تو مت لے چلتے ہیں ہم آپ کو ساتھ۔۔۔۔

وہ کمزور لہجے میں بولی۔۔۔۔

وہ یکدم خوش ہوئی

لیکن اگلے ہی جملے پہ اس کی خوشی معدوم ہوئی۔۔۔۔

”لیکن ہماری ایک شرط ہے۔۔۔۔“؟

”آپ گاڑی سے باہر نہیں نکلیں گی“

انہوں نے سختی سے تلقین کی

وہ آنسو پونچھتی خوشی سے ان سے لپٹ گئی۔۔۔۔

”آپ فکر نہ کریں جیسا کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔۔۔۔“

وہ ان کا گال چومتی اٹھ کھڑی ہوئی

اور وہ ٹھیک سے مسکرا بھی نہ پائی
پتہ نہیں وہ اسے لے کہ کیوں اتنے خدشات کی شکار تھی۔۔۔۔
شاید وہ خوبصورت تھی
یا کوٹھے میں رہتی تھی۔۔۔۔؟
وہ سمجھ نہیں پار ہی تھی۔۔۔۔



جس وقت وہ سب اس سبز و شاداب گاؤں میں پہنچے اس وقت شام کا ہلکا ہلکا اندھیرہ پھیل رہا تھا
گاڑی فرائے بھرتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی پردے سے جھلکتی دو خوبصورت آنکھیں
للچائی ہوئی نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی
یہ گاڑی کاشیشہ نیچے کر کے باہر کے مناظر کو دیکھنے کا اس کا برسوں کا شوق پورا ہو رہا تھا وہ خوش
کیوں نہ ہوتی۔۔۔۔

ساتھ بیٹھی جہاں آراۛ سے دھیمی آواز میں ہدایات دے رہی تھی
اور نگار بیگم یہ سوچ سوچ کہ حیران ہو رہی تھی کہ جس لڑکی کو اس نے کبھی کمرے سے باہر
نہیں نکالا آج کوٹھے سے باہر لے آئی وہ بھی خانوں کی حویلی میں۔۔۔۔
خیر سن گلاسز ٹھیک آنکھوں سے اتار کہ ڈیش بورڈ پہ رکھ کہ سر پیچھے کی طرف ٹکا کہ ذہن میں
حساب کتاب کرنے لگی۔۔۔۔
پیچھے بیٹھی زرباش اپنی ماں کی ہدایات کو سنی ان سنی کرتی باہر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔



جس وقت ان کی گاڑی ڈیرے پہنچی رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ جہاں آراۛ
گاڑی سے اترتے وقت بھی عجلت میں اسے ہدایات دے رہی تھی اور وہ محض سر ہلارہی
تھی۔۔۔۔

گاڑی کو حویلی سے بہت پیچھے کھڑا کیا گیا تھا تا کہ کوئی زرباش کو دیکھ نہ پائے۔۔۔۔۔

جہاں آرا کا بس چلتا تو اسے اکیلا چھوڑ کے نہ جاتی۔۔۔۔۔

لیکن مجبوری تھی اندر سب کچھ اسی نے سنبھالنا تھا۔۔۔۔۔

”جہاں آرا اب چلی مئے بھی۔۔۔۔۔ اندر سب انتظار کر رہے ہونگے۔۔۔۔۔“ زری بچی

نہیں ہیں خود کو سنبھال لیں گی

تیکھی نظروں سے زری کو دیکھ کہ جتاتے ہوئے کہتی آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔

جہاں آرا بھی منہ ڈھانپ کہ۔۔۔۔۔ جانے لگی پھر پلٹی

”زرپاش۔۔۔۔۔ اگر مجھے دیر بھی ہو جائے تو آپ گاڑی سے باہر مت نکلی مئے گا۔۔۔۔۔ چہرہ

ڈھانپ کہ رکھی مئے گا۔۔۔۔۔“ ٹھیک ہے اور اپنا بہت بہت خیال رکھی مئے گا۔۔۔۔۔“

وہ اس کا ماتھا چوم کہ اب ڈرائیور کو ہدایات دے رہی تھی

اور زرپاش کا دھیان کہیں اور تھا۔۔۔۔۔



میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سمیٹ کر
وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا

”اس بڑے سے ڈیرے کے اندر۔۔۔۔۔ رقص پورے آب و تاب کے ساتھ جاری تھا ہنسی
قہقہے روشنیاں کیا کچھ نہیں تھا لیکن پتہ نہیں یہ سب مصنوعی کیوں تھا۔۔۔۔۔
اور وہ کتنی دیر سے باہر بیٹھی بور ہو رہی تھی سوچ رہی تھی وہ نہ ہی آتی یہاں۔۔۔۔۔
یوں قید ہو کہ تو نہ بیٹھی ہوتی وہ تو گاؤں گھومنے کی غرض سے آئی تھی اور اب وہ باہر گھومنا
تو دور باہر بھی نہیں جاسکتی تھی
اسے اپنے نصیب پر جی بھر کہ رونا آیا تھا
بے دھیانی سے جیسے ہی رخ موڑا ڈرائی یور کو فرنٹ سیٹ پہ اونگھتے پایا پھر سے باہر دیکھنے
لگی۔۔۔۔۔

یکدم اس کی سنہری آنکھیں چمکنے لگی

پھر پلٹی۔۔۔۔۔

ایک نظر دیکھا ہولے سے ہنسی۔۔۔۔۔

”اگر خدا موقع دے تو کون کافر ہے جو اس موقع کو جھٹلائے۔۔۔۔۔۔۔“

اور آرام سے دروازہ کھولا پلٹ کہ ایک نظر دیکھا وہ ابھی بھی سو رہا تھا اور ان کے واپس آنے کا

امکان نظر نہیں آ رہا تھا موقع اچھا تھا۔۔۔۔۔

شام کے اس پہر یہ جگہ عجیب خوفناک سا منظر پیش کر رہی تھی لہلہاتے کھیت اندھیرے میں

ڈوبے ہوئے دیکھائی دیتے تھے یہ مغرب سے ایک دو گھنٹے بعد کا وقت تھا

ابھی۔۔۔۔۔۔۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا اکا دکا گھروں کے لیمپ روشن تھے

وہ کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈوپٹے سے منہ چھپائے آگے بڑھتی جا رہی تھی

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائی۔۔۔۔۔ بہت عرصے بعد اس نے کھل کہ سانس لی تھی

وہ بہت اچھا محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔

آج اسے اندھیرے سے خوف نہیں آرہا تھا۔۔۔۔۔

اس خوشی میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ گاڑی سے بہت آگے نکل آئی ہے۔۔۔۔۔

ہوش اسے تب آیا جب۔۔۔۔۔ وہ کسی چیز سے بری طرح ٹکرائی۔۔۔۔۔ اس کا پاؤں بری

طرح مڑا تھا اور شاید کسی چیز نے کاٹ بھی لیا تھا

اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔۔۔۔۔

اندھیرے میں وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پارہی تھی کہ وہ بیٹھی ہوئی کدھر ہے

سامنے سے آتے تیز رفتار گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے پتہ چلا کہ وہ کچی سی سڑک پہ

گری ہوئی ہے۔۔۔۔۔

اس نے دہشت کے مارے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا

پتہ نہیں کیوں اسے اپنی موت اتنے قریب نظر آئی۔۔۔۔۔



گزر رہے شب کو دشت سے شاید وہ پردہ دار

ہر نقش پا کے ساتھ ردا کی لکیر تھی

”ارے شاہ ویز خان جی۔۔۔۔۔ وہاں خان ہمیں بلا کہ خود کہاں چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟“

رانی نے پاؤں سے پائی ل کھولتے ہوئے تلاشتی نظروں سے وہاں کے ایک دوست سے پوچھا
تھا۔۔۔۔۔

رقص کے دوران اس کو نہ پا کر۔۔۔۔۔ اس کا سارا مزہ اور موڈ خراب ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

”ارے رانی جی آپ کو تو اس کا پتہ ہے نا کہاں کسی کی بات سنتا ہے کہہ رہا تھا جلدی آجوں گا
دیکھی مئے ناگھڑی سات کا ہندسہ عبور کر گئی اور وہ ابھی تک نہیں پہنچے۔۔۔۔۔“

اس نے مدہوش لہجے میں جواب دیا

رانی نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ سجا کہ محض سر ہلا دیا تھا۔۔۔۔۔

”اور آپ کبھی ہم پہ بھی نظریں کرم کر دیا کریں مانو ہاج جیسے خوبرونا سہی لیکن کم ہم بھی نہیں ہیں۔۔۔۔“

اس کی لمبی سیاہ زلفوں میں چہرہ چھپائے وہ حوس بھری نظروں سے اس کے سراپے کو گھور رہا تھا

اور وہ جیسے کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھی تھی
اور دور بیٹھی جہاں آرا دکھ سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔
انہیں اپنی بیٹی کی فکر کھائے جارہی تھی۔۔۔۔

اور نگار بیگم رقص کرتی لڑکی پہ پیسوں کی بارش ہوتے دیکھ کہ پھولے ناسمارہی تھی
پیسہ اتنا قیمتی تھا کہ اس کے سامنے کسی کا جسم کسی کے احساسات ستے تھے۔۔۔۔
”اسی وقت دور اس کچی سڑک پہ اس کے بالکل قریب آکہ کسی نے بریک ماری تھی
ٹائی روں کی چرچراہٹ کی آواز سے اس نے سراٹھایا تھا

گاڑی کا دروازہ کھلا تھا اور کوئی بیباہر نکلا تھا

وہ مدہم روشنی میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ سامنے کوئی بی مرد ہے لیکن کتنی عمر کا ہے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔۔۔۔۔

گاڑی کی ہیڈ لائیٹس آن تھی

جب وہ قریب آیا تو وہ اس کا چہرہ واضح ہوا

چہرہ پہ غصہ واضح تھا

”محترمہ۔۔۔۔۔ آپ کو مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔۔۔۔۔ کسی کنویں میں چھلانگ لگا دیں

یوں راستے میں نہ بیٹھیں ابھی آپ کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا

سر جھکا کہ بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ کہ وہ روکھے لہجے میں بولا

تو وہ ہچکیوں سے رونے لگی وہ سر ابھی تک جھکا رکھا تھا

”اب نیا ڈرامہ شروع۔۔۔۔۔“

کون ہیں آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔۔۔؟“

وہ اسے روتا دیکھ کہ ذرا نرم پڑ گیا

وہ خاموش رہی

اسے خاموش دیکھ کہ وہ چڑ گیا

اس لیے اس بار ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

”محترمہ آپ مجھے بتائی یں آپ کون ہیں ورنہ راستے سے ہٹ جائی یں۔۔۔“

اسی لمحے اس نے سر اٹھایا تھا وہ اسے دیکھ کہ مبہوت رہ گیا تھا

گول چہرہ سفید رنگت۔۔۔۔۔ بڑی بڑی سنہری آنکھیں تیکھی ناک عنابی ہونٹ۔۔۔۔۔ پلوں

کو چھوتا کا لے رنگ کا فراک۔۔۔۔۔ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا دوپٹہ البتہ سر پہ ٹکا

رکھا تھا چہرے پہ آنسوؤں کے نشان تھے اور کا جل گال پہ بہہ گیا تھا

وہ وہی کھڑا یہ سوچ رہا تھا کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے

اسی لمحے اس کے دل میں اس معصوم لڑکی کے لیے ہمدردی جاگی۔۔۔۔۔
وہ اپنے سفید لباس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے قریب بیٹھا۔۔۔۔۔
اس نے چونک کہ اسے دیکھا۔۔۔۔۔
”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔۔۔۔۔
تو وہ ایک دفعہ پھر رونے لگی
”ہم اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔۔۔۔۔ اور ہمارا پاؤں بھی زخمی ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ شاید
کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔۔۔“
وہ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کہ رونے لگی
دیکھائی یئے اپنا پاؤں۔۔۔۔۔؟

ہیڈ لائی ٹس کی مدد ہم روشنی میں اس نے دیکھا اس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا تھا

اس نے اس کا پاؤں اپنی گود میں رکھا
اس لمحے کوئی ہی اسے دیکھ لیتا تو ہر گز یقین نہ کرتا کہ یہ وہی مغرور انسان ہے
اسے خود یقین نہیں آ رہا تھا وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔۔۔۔
پاؤں سے کانٹا نکالا تو اس نے ہاتھ پکڑ کہ اسے روکنا چاہا۔۔۔۔
”درد ہو گا مجھے اس نے معصومیت سے کہا
تو وہ دھیرے سے مسکرایا
”نہیں ہو گا“
ساتھ ہی اس کے نازک پاؤں سے کانٹا نکالا۔۔۔۔
وہ ہلکا سا سسکی۔۔۔۔
پھر جیب میں سے رومال نکال کہ اس کے پاؤں پر باندھا۔۔۔۔
اور اٹھ کھڑا ہوا

آئی یں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔۔۔۔

”کچھ تو یاد ہو گا آپ کو؟“

اس نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

پہلے وہ ہچکچائی ی پھر اس کا ہاتھ تھام کہ اٹھ کھڑی ہوئی ی

اس نے دروازہ کھول کہ اسے بیٹھایا۔۔۔۔

اور خود ڈرائی یونگ سیٹ سنبھال لی

اب وہ گاڑی چلا رہا تھا

اور وہ اپنی انگلیاں مڑوڑ رہی تھی

ڈرائی یور جاگ گیا ہو گا اماں جان کو بھی پتہ چل گیا ہو گا

وہ ذہن میں سوچے جارہی تھی۔۔۔۔

کوئی ی نشانی بتائی ی مئے گھر کی یا والد کا نام

وہ سنجیدگی سے ونڈ اسکرین کے باہر دیکھتے ہوئے بولا تو وہ چونکی

”جی میں کسی کے گھر مہمان آئی ہوں۔۔۔۔۔ جو وہاں خان کا ڈیرہ ہے نا۔۔۔۔۔“ اس

کے قریب ہی گھر ہے۔۔۔۔۔“

اس نے نا سمجھی میں بولتے ہوئے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا

وہ اس کی اس مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھ پائی۔۔۔۔۔

اوہ اچھا۔۔۔۔۔“

اس نے بھی زیادہ بحث نہ کی

شنا سا جگہ کو دیکھ کر وہ چہکی۔۔۔۔۔

بس یہی روک دیجیئے۔۔۔۔۔

”یہاں ہے آپ کا گھر؟“

اس نے سر باہر نکال کہ ایک دو گھروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”آئی یں میں۔۔۔۔۔ آپ کو چھوڑ دوں۔۔۔۔۔“؟

وہ ڈرائی یونگ سیٹ سے اترنے لگا

”نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔“ چاچا پتہ نہیں کیا سمجھیں بہت شکریہ آپ کا۔۔۔۔۔“

وہ تیزی سے شکریہ ادا کر کے اترنے لگی

جب اس نے اسے پکارا

”آپ کا نام۔۔۔۔۔“؟

مسکراتے ہوئے سوال کیا گیا تھا

اور وہ سوچ رہی تھی سچ بولے یا جھوٹ۔۔۔۔۔؟

”زیرپاش۔۔۔۔۔“

جلدی سے کہہ کہہ دوپٹہ درست کرتی لڑکھڑاتے قدموں سے وہ آگے بڑھ کہ اندھیرے میں

وہ غائب ہو گئی۔۔۔۔۔

و

وہاں کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا

اسی لمحے اس کی نظر اپنی گاڑی میں گری پائی ل پر پڑی

وہ یقیناً زرپاش کی تھی

اٹھا کہ ایک نظر پائی ل کو دیکھا۔۔۔۔ اور مسکرا دیا۔۔۔۔

ابھی پچھلے دنوں جو ہم پر گزری

اسی رت کا نشہ طاری ہے اب تک۔۔۔۔

شام کے اس گہرے کالے سیاہ اندھیرے میں جب اس جگہ پہ محض جنگلی جانوروں کی غراہٹ

تھی۔۔۔۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے ہی گاڑی کے پاس پہنچی اس کے اوسان خطا ہو

گئے۔۔۔۔

گاڑی کے بالکل پاس ٹیک لگائے لا پرواہی سے پان کھاتی نگار بیگم کھڑی تھی

اور پاس ہی اس کی ماں کھڑی رو رہی تھی۔۔۔۔۔

اور ساتھ ہی ڈرائی یور سر جھکا کہ کھڑا تھا

وہ تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے ہی تیز قدم اٹھاتی۔۔۔۔۔ ان کی طرف لپکی

اس کی آواز سن کے جہاں آرا پیچھے پلٹی۔۔۔۔۔ تو وہ ان کے گلے لگ گئی۔۔۔۔۔

”اماں جان ہمیں معاف کر دیں۔۔۔۔۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے اماں

جان۔۔۔۔۔“

وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔۔۔۔۔

اور وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی

”آپ گئی کہاں تھی۔۔۔۔۔ زرا پاش۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔۔۔۔۔

”اماں جان ہم آپ کو گھر پہنچ کے سب بتا دیں گے۔۔۔۔۔“

ابھی آپ ہمیں یہاں سے لے چلیں۔۔۔۔۔

اس نے ان سے الگ ہو کے آنسو پونچتے ہوئے کہا

”ہاں ہاں چلو گاڑی میں بیٹھو باقی تفتیش گھر میں جا کے کر لینا دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے منہ سے پان تھوک کہ تالی بجاتے ہوئے کہا

تو باہر کھڑی سب طوائی فیں اپنے پردے درست کرتی۔۔۔۔۔ گاڑی میں بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

جہاں آرا نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

زرپاش نے پلٹ کر اس اونچی حویلی کو دیکھا جیسے ہی باہر کھڑی گاڑی کو دیکھا وہ ٹھٹکی۔۔۔۔۔

”زرپاش آپ نے رات یہی گزارنی ہے کیا۔۔۔۔۔“

”نگار بیگم نے شیشے سے باہر جھانک کہ اسے متوجہ کیا۔۔۔۔۔

”نہیں میں تو وہ بس۔۔۔۔۔؟“

اس سے بات نہیں بن پار ہی تھی۔۔۔۔۔

”حویلی کو مت دیکھی مئے یہ آپ جیسی لاوارث کو ٹھوں پہ پلنے والیوں کے لیے نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔“ ”کوٹھے پہ جو رہتی ہے وہ رقص کرے یا نہ کرے رہتی وہ طوائف ہی ہے بیوی نہیں بنتی۔۔۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے جیسے زریپاش کا مذاق اڑایا تھا
 زریپاش نے تڑپ کہ اپنی ماں کو دیکھا تھا
 جو سر جھکائے بیٹھی تھی

وہ جانتی تھی۔۔۔۔۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ چپ ہی رہے گی
اسی لیے خاموشی سے دروازہ کھول کہ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔
اور گاڑی تیز سپیڈ سے آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔

پیچھے خان حویلی ویران سنسان سی رات کے اس پہر اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔۔۔۔۔



وہی راتوں کی بیداری ہے اب تک
تمنا کا سفر جاری ہے اب تک۔۔۔۔۔
گناہوں کی سیاہی میں ڈوبایہ کوٹھارات کے اس پہر صحیح معنوں میں اندھیرے میں ڈوبا
تھا۔۔۔۔۔

رات کی سیاہی نے گناہوں کی سیاہی پر پردہ ڈال دیا تھا
وہ پلنگ کہ ساتھ ٹیک لگا کہ بیٹھی تھی
پاس ہی جہاں آراۓ عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔۔۔۔۔
وہ چھت کو گھور رہی تھی
انہوں نے نماز ختم کی جائے نماز تہہ کی۔۔۔۔۔ اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔۔۔۔۔
اس کے لمبے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔۔۔۔۔
اس نے چپ چاپ سران کی گود میں ٹکا دیا۔۔۔۔۔

”اور ہم سے وعدہ کریں زریپاش جو حرکت آپ نے آج کی وہ آپ آئی نہ نہ نہیں کریں گی

ہمارے سر کی قسم کھا کہ یہی مئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

وہ جذباتی ہوگئی تھی۔۔۔۔۔

”اماں جان ہم آپ کے سر کی قسم کھا کے کہتے ہیں ہم دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں

“ _____ ”

اس نے ان کے سر پہ ہاتھ رکھ کے کہا

توان کے چہرے پہ اطمینان نظر آیا۔۔۔۔۔

”یہ تو اچھا ہوا آپ کو کوئی ی نیک بندہ مل گیا۔۔۔۔۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں ورنہ اگر کچھ

غلط ہو جاتا تو سوچ کہ ہی روح کانپ جاتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ اب اٹھ کہ بستر ٹھیک کر رہی تھی

اس نے بے دھیانی سے سنا۔۔۔۔۔

”کیا آپ نے انہیں سچ بتا دیا تھا۔۔۔؟“

یکدم انہیں یاد آیا تو پلٹ کے رازداری سے پوچھا گیا تھا

”نہیں ہم نے جھوٹ بولا۔۔۔۔۔“

کہ ہم یہاں مہمان آئی ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے لا پرواہی سے بتایا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔۔۔۔۔

جہاں آراۓ بس اسے دیکھ کہ رہ گئی۔۔۔۔۔

وہ ننھی سے ان کی گڑیا کب اتنی بڑی ہو گئی تھی

ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگی

ٹھیک ہے زرباش کو انہوں نے جنم نہیں دیا تھا لیکن پالا تو خود انہوں نے ہی تھا

اور اب ہر وقت انہیں زریاش کی ہی فکر ستاتی تھی

کہ خدا نخواستہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو نگار بیگم اس کو بھی دھندے پہ لگا دیں گی۔۔۔۔۔

ان سوچوں کی وجہ سے آج کی رات بھی وہ سو نہیں پار ہی تھی۔۔۔۔۔



لوگوں کے لیے صاحب کردار بھی میں تھا

خود اپنی نگاہوں میں گناہگار بھی میں تھا

صبح کی کرنوں نے اس حویلی کو اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا تھا کچن سے ناشتے کی خوشبو آرہی تھی

سامنے صوفے پہ میرداد خان اپنے دونوں بیٹوں شہباز خان اور رجب خان کے ہمراہ کسی خاص معاملے پہ بات کر رہے تھے۔۔۔۔۔

یہاں سے ہوتے ہوئے جاؤ تو اوپر والے حصے میں وہ اپنے کمرے میں بکھرے سے حویلیے میں

پریشان سے بیٹھا تھا

سامنے ایک چھوٹی عمر کا ملازم کھڑا تھا

”چھوٹے خان۔۔۔۔۔جی میں نے اس جگہ کے ارد گرد ہر ایک مکان سے پوچھا وہاں اس نام کی کوئی لڑکی نارہتی ہے اور نہ کسی کے گھر مہمان آئی تھی۔۔۔۔۔اور نہ اس پائی ل کی دوسری جوڑی ہے کسی لڑکی کے پاس۔۔۔۔۔“

اس ملازم نے دس دفعہ کی کہی بات دوبارہ دہرا دی۔۔۔۔۔

ہوں ٹھیک ہے تم جاؤ۔۔۔۔۔

ہاتھ کے اشارے سے اسے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا

یہ لڑکی اس کے لیے دردِ سر بن گئی تھی

اسے خود نہیں پتہ تھا وہ کیوں اسے ڈھونڈ رہا ہے

دس دنوں سے نوکروں کو پورے گاؤں کی دوڑیں لگوائی تھیں خود بھی دس دفعہ اس جگہ گیا

تھا لیکن اس نے نہیں ملنا تھا وہ نہیں ملی تھی۔۔۔۔۔

اب وہ مایوس ہونے لگا تھا

تیزی سے تیار ہو کہ وہ سیڑھیاں اتر کے جیسے ہی نیچے اترا۔۔۔۔

سامنے بڑے صوفے پہ بیٹھے اپنے باپ رجب خان کو بیٹھا دیکھ کہ طاعناری سے ان کی طرف
بڑھا۔۔۔۔۔

ان کی گردن کچھ اور اکڑ گئی۔۔۔۔۔

شہباز خان نے ایک نظر۔۔۔۔۔ میرداد خان کو دیکھا ان کے چہرے پہ بھی فخر تھا
پھر سر جھکا لیا۔۔۔۔۔

”کہاں جا رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے وہی کھڑے کھڑے پوچھا۔۔۔۔۔

”سوچا کہ ایک چکر یتیم خانے کا لگاؤں کچھ چیزیں تقسیم کر آؤں۔۔۔۔۔“

وہ ابھی تک سر جھکائے کھڑا تھا

رجب خان نے ایک جتنا ہی ہوئی نظر اپنے بھائی پر ڈالی۔۔۔۔۔

جیسے کہہ رہے ہو

دیکھو یہ میرا بیٹا ہے۔۔۔۔۔“

پھر اسے ماتھے پہ پیار کیا۔۔۔۔۔

میرداد خان کی مسکراہٹ معدوم ہوئی

اس گھر میں وہاں خان کو ایک ہی شخص ٹھیک سے جانتا تھا اور اس کے سارے گناہوں پہ پردہ

بھی ڈالتا تھا وہ تھے میرداد خان

باقی سب کے لیے وہ ایک آئی یڈیل تھا

”ٹھیک ہیں جائیں آپ۔۔۔۔۔“

وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔۔۔۔۔

اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا

جیب سٹارٹ کی اب اس کا رخ کوٹھے کی جانب تھا

اندر بیٹھے افراد ابھی بھی اس کے گن گارہے تھے۔۔۔۔



وہ جانتا ہے کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں

پکارتا رہا اس کو ادھر ادھر کیسے؟

جھلملاتی روشنیوں سے مزین۔۔۔۔ اس کو ٹھٹھے میں جہاں اس پہر پریاں اترتی تھی خوب چھل
پہل تھی۔۔۔۔

باہر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔۔۔۔۔

لیکن اندر بیٹھی نگار بیگم فون پہ کسی کو ہدایات دے رہی تھی

بجلی آج بہت مسئی لہ کر رہی ہے آپ فوراً آجائی یئے جرنیٹر سیٹ کر

دیں۔۔۔۔۔ تاکہ۔۔۔۔۔ ہمارے مہمانوں کو کوئی ی دکت نہ ہو۔۔۔۔۔

ساتھ ہی کمرے سے چمکیلی ساڑھی پہن کے نکلتی۔۔۔۔۔ جہاں آرا پلٹ پلٹ کے زرخاش کو
ہدایات دے رہی تھی

”اگر پورا کوٹھا بھی تاریکی سے بھر جائے تب بھی ہم آپ کو باہر نکلنے کی ہدایت نہیں
دیتے۔۔۔۔۔“

نیچے پارکنگ میں جیپ آ کے رکی تھی
کالے رنگ کی شلوار قمیض اوپر واسکوٹ پہنے وہ اپنی ازلی شان و شوکت کے ساتھ گاڑی سے
باہر نکلا تھا۔۔۔۔۔

اب وہ سڑھیاں چڑھ رہا تھا

”اندر زرخاش براسامنے بنا کے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔“

اس دفعہ آپ نے کوئی ی گڑبڑ کی نا۔۔۔۔۔ تو ہم سے برا کوئی ی نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ ہم چکر
لگاتے رہیں گے۔۔۔۔۔

وہ کہہ کے باہر جا چکی تھی۔۔۔۔

وہ سڑھیاں عبور کر کے جیسا ہی اوپر پہنچا۔۔۔۔

اس کا رخ نگار بیگم کے کمرے کی جانب تھا

پورا کوٹھا اندھیرے میں ڈوب گیا

اندر کمرے میں بیٹھی زرباش نے اٹھ کے لیپ جلانے کی کوشش کی لیکن لیپ کا تیل ختم ہو گیا
تھا

اس نے اندھیرے میں ہی ماچس اٹھائی جلائی اور اس کی روشنی میں موم بتی

ڈھونڈی۔۔۔۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔۔۔۔۔



جس کی یادوں سے خیالوں کے خزانے دیکھے

اس کی صورت بھی آج لگی فقیروں جیسی

اندھیرے میں اسے پتہ نہیں چلا اور وہ نگار بیگم کے کمرے کے بجائے۔۔۔۔۔ شاید کسی اور
کے کمرے میں آگیا تھا

اندر موجود لڑکی کے ہاتھ میں جلتی ماحس کی مدہم روشنی میں وہ موم بتی جلاتی۔۔۔۔۔ لڑکی کی
پیٹھ ہی دیکھ سکتا تھا۔۔۔۔۔

”اماں جان دیکھیئے نالیمپ کا تیل ختم ہو گیا ہے اور بجلی بھی دیکھیئے آج ہی جانی
تھی۔۔۔۔۔“

وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی
وہ سمجھی تھی شاید اس کی ماں ہے۔۔۔۔۔

اور یہ آواز وہ کیسے بھول سکتا تھا

جسے وہ پچھلے دس دنوں سے ڈھونڈ رہا تھا وہ یہاں کوٹھے پہ اسے ملے گی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا

اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کہ باہر نکل جاتا

وہ ہاتھ میں موم بتی پکڑے پلٹی

مدہم روشنی میں دونوں کے چہرے واضح ہوئے۔۔۔۔۔

خوف کے مارے اس کے ہاتھ میں پکڑی موم بتی گر کر بجھ گئی۔۔۔۔۔

کمرہ ایک دفعہ پھر۔۔۔۔۔ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔۔۔۔۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی وہ خود یہاں سے بھاگے یا اسے جانے کے لیے کہے وہ اس کے کسی

سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔

وہ خود باہر جانے کے لیے آگے بڑھی یکدم کسی چیز سے ٹکرائی اس سے پہلے کہ وہ گرتی کسی

نے اسے بازو سے تھام لیا تھا

وہ اس کے علاوہ اور ہو بھی کون سکتا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کو دس دنوں سے ڈھونڈ رہا تھا آپ کی ایک امانت رہ گئی تھی میرے پاس کہ آپ کو لٹا دوں۔۔۔۔۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ آپ مجھے کوٹھے کی طوائف کہ روپ میں ملیں گی۔۔۔۔۔“

اس نے جتاتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اسے چھوڑ دیا تھا
اور جا چکا تھا

اس کے جملوں کی گونج اسے ابھی بھی سنائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔
وہ چیخ چیخ کہہنا چاہتی تھی کہ وہ طوائف نہیں ہے لیکن اب یہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔



منزل پہ جو پہنچا ہوں تو معلوم ہوا ہے
خود اپنے لیے راہ کی دیوار بھی میں تھا۔۔۔۔۔

وہ تیزی سے باہر نکلا تو سامنے سے آتی رانی سے ٹکرا گیا۔۔۔۔۔

رانی جیسے اسی موقع کی تلاش میں تھی۔۔۔۔۔

جلدی سے اس کا راستہ روک دیا

اس نے ایک تپتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔۔۔

”خان جی۔۔۔۔۔ کبھی ادھر بھی نگاہیں کر دیا کریں۔۔۔۔۔

نیم برہنہ لباس پہنے ڈارک میک آپ میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی

۔۔۔۔۔

”حد میں رہو اپنی۔۔۔۔۔“

وہ غصے میں کہتا جان چھڑا کے جانے لگا۔۔۔۔۔

”آپ کچھ وقت گزاریں گے تو آپ کو بھی دل لگی ہو جائے گی۔۔۔۔۔“

اس نے گریبان سے پکڑ کے اسے نزدیک کرنا چاہا

وہ دو قدم پیچھے ہو گیا۔۔۔۔۔

”میری جان تم بہت خوبصورت سہی لیکن ہو تو طوائف ہی تمہارے ساتھ دل بہلایا جاسکتا ہے دل لگایا نہیں جاسکتا۔۔۔۔۔“

اسے ایک جھٹکے سے دھکا دے کے وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔۔۔۔۔

”تو جسے وہ دس دنوں سے ڈھونڈ رہا تھا وہ طوائف تھی۔۔۔۔۔؟“

”تو کیا اس دفعہ وہاج خان۔۔۔۔۔ ایک طوائف کی چاہت کر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ دل بہلانا چاہتا تھا لیکن وہ دل لگا بیٹھا تھا

وہ ماننے سے انکاری تھا۔۔۔۔۔



آج گم سم ہے جو برباد جزیروں جیسی

اس کی آنکھوں میں چمک تھی کبھی ہیروں جیسی

رات کا گہرا سایہ کسی آسیب کی طرح اس روشنیوں سے جھلملاتے کوٹھے کو اپنی لپیٹ میں لے
رہا تھا۔۔۔۔۔ درختوں کو چھوتی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا درختوں کو چیر کے آگے گزر جاتی
تھی۔۔۔۔۔ کچھ پتے لرز کے زمین بوس ہو جاتے تھے۔۔۔۔۔ اندر کوٹھے میں پریوں کا
رقص اختتام پذیر ہوا تھا۔۔۔۔۔ زمین پہ بیٹھی رانی پاؤں سے گھنگھرو اتار رہی تھی
پاس کھڑی نگار بیگم سر جھکا کے کھڑی جہاں آرا کو ہدایات دے رہی تھی۔۔۔۔۔
وہاں سے دائی ہاتھ کو جاؤ تو اس چھوٹے سے سجے ہوئے پلنگ پہ وہ گھٹنوں میں سر دے کے
بیٹھی رو رہی تھی

پاس ایک تصویر پڑی تھی آنسو اس تصویر پہ گر رہے تھے
وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں شکوہ سننے والا کوئی نہیں تھا
دور ٹائی روں کی چرچر اہٹ نے خاموشی کو توڑا تھا

وہ تیزی سے جیپ سے نکلا تھا اور حویلی کے اندر داخل ہوا تھا چہرہ سپاٹ تھا لیکن آنکھوں میں وحشت تھی۔۔۔۔

اندر حویلی میں ڈائی ننگ ٹیبل پہ بیٹھے سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا

سب لوگوں نے رخ موڑ کے اسے دیکھا تھا
”آؤ وہاں کھانا کھا لو۔۔۔۔۔“

رجب خان نے پلٹ کر خوشدلی سے اسے کہا تھا
وہ ایک نظر سب کو دیکھ کے کچھ بھی کہے بغیر چلا گیا تھا۔۔۔۔
سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا
ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے رجب خان کا کوئی حکم نہ مانا ہو۔۔۔۔۔
”شاید اس کی طبیعت خراب ہے۔۔۔۔۔“

رجب خان نے خود سے ہی اندازہ لگا کے۔۔۔۔۔ سب کو مطمئن کرنا چاہا۔۔۔۔۔

وہ اوپر کمرے کا دروازہ بند کر کے سارے کمرے کا نقشہ تبدیل کر چکا تھا

دور دروازہ کھول کے جیسے ہی اندر آئی ی چونک گئی۔۔۔۔۔

پلنگ پہ زرپاش آنکھیں بیٹھی رو رہی تھی

آنکھیں متورم اور پپوٹے سو جے ہوئے تھے بال بکھرے ہوئے تھے

وہ تڑپ کے اس کی طرف گئی۔۔۔۔۔

”کیا ہوا آپ کو زری آپ روکیوں رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ اپنی ماں کو قریب پا کے لپٹ کے رو پڑی

اس کی ہچکی بندھ گئی۔۔۔۔۔

جہاں آرا۶ اور زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔۔۔۔۔

”آپ ہمیں کچھ بتا کیوں نہیں رہی زری سب ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔؟“

وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔۔۔۔

”اماں جان۔۔۔۔ ہم کوٹھے میں کیوں ہیں ہم رقص نہیں کرتے اماں جان پھر کیوں ہمیں
بھی طوائف سمجھا جاتا ہے

وہ انہی سے لپٹ کے روتے ہوئے بتا رہی تھی

”اور اماں جان یہ انسان۔۔۔۔ کیوں ہمیں سڑک کنارے لاوارث جھولے میں چھوڑ
گیا۔۔۔۔

اور ساتھ یہ تصویر بھی چھوڑ گیا کہ ہم اپنے ماضی کو لے کے تڑپتے رہیں۔۔۔۔ جب پرانے
رشتے توڑ گیا تھا تو کیوں یہ تصویر چھوڑ گیا

اس نے تصویر اچھالی

جہاں آرا بھی بے آواز رو رہی تھی

آج اس کے پاس تسلی کے لیے الفاظ نہیں تھے۔۔۔۔

بڑی حویلی میں۔۔۔۔۔ وہ رات کے اس پہر اندھیرہ کر کے بیٹھے تھے
سگریٹ سے نکلتے دھوئیں کے مرغولے عجیب و غریب اشکال بناتے ہوئے کمرے میں محور قص
تھے

اور ان کی سوچوں کا محور ان کا ماضی تھا
کہتے ہیں کسی کے ساتھ کیا گیا ظلم بھی آسیب کی طرح ہوتا ہے جتنا آپ اس سے پیچھا چھڑاتے
ہیں اتنا وہ آپ کو اپنے شکنجے میں لیتا ہے
ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا

زندگی کے جتنے سال۔۔۔۔۔ وہ اس کے بھول گئے تھے

مہر النساء کو تو یہی لگتا تھا

لیکن وہ اسے کبھی نہیں بھولے تھے

اولاد کہاں اتنی جلدی بھولائی جاسکتی ہے

اسی سوچ نے انہیں ایک دفعہ پھر احساس جرم کا شکار کر دیا تھا
ماضی کے کچھ لمحے پھر سے درپچوں پہ دستک دینے لگے تھے
جس سردشام میں وہ اس ننھی بچی کو گود میں بھر کے کھڑے مہر النساء سے رحم کی درخواست
کر رہے تھے

کبھی نہ بولنے والی مہر النساء آج بول رہی تھی
اور وہ سن رہے تھے

شہباز خان۔۔۔۔۔ میں نے آپ کا ہر ایک ستم برداشت کیا۔۔۔۔۔ لیکن بس اب میری
برداشت جواب دے گئی ہے۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ مجھ سے امید مت رکھیئے
گا۔۔۔۔۔

میں اس بچی کو قبول نہیں کر سکتی جو آپ کی محبت کی آخری نشانی ہے۔۔۔۔۔

انہوں نے آنسو پیتے ہوئے جھولے میں پڑی۔۔۔۔۔ اس چھوٹی سی خوبصورت سی بچی کو
دیکھا۔۔۔۔۔

جو بھوک کے مارے بلک بلک کے رو رہی تھی۔۔۔۔۔

مہر النساءؑ میں اس کو کدھر لے کے جاؤں اس کا کوئی ی بھی نہیں رہا اس دنیا میں۔۔۔۔۔“
انہوں نے لب کچلتے ہوئے بے بسی سے کہا۔۔۔۔۔

”میں نہیں جانتی۔۔۔۔۔ یہ بات میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ بچی آپ کا وہ ستم
ہے۔۔۔۔۔ جس ستم نے میری ذات کی دھجیاں بکھیر دی۔۔۔۔۔“

مجھے تو یہ تک نہیں معلوم یہ بچی آپ کی جائی زاولاد ہے بھی یا نہیں۔۔۔۔۔“
وہ غصے کی انتہا پر تھی

اور تبھی۔۔۔۔۔ شہباز خان پلٹے ان کا ہاتھ اٹھنے والا تھا لیکن ضبط کر گئے۔۔۔۔۔

”میں کچھ نہیں جانتی شہباز خان۔۔۔۔۔ آپ کو کسی ایک کو چننا ہو گا یا مجھے اور اپنی بچیوں کو۔۔۔۔۔ یا اس کو۔۔۔۔۔“

انہوں نے نخت سے جھولے میں روتی ہوئی بیچی کو دیکھا
اور اگر آپ اسے نالے کے گئے نا۔۔۔۔۔ تو میں خود اسے آگ لگا دو گی زہر دے دوں
گی۔۔۔۔۔

وہ ہذیانی کیفیت میں اس بچی کی طرف لپکی ان کے سر پر خون سوار تھا۔۔۔۔۔
مہر النساء اللہ سے ڈرو ایک بچی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے میں اسے کدھر لے کے جاؤں انہوں نے
مہر النساء سے پہلے ہی بچی کو اٹھا کے گود میں بھر لیا
بچی کو جیسے قرار مل گیا۔۔۔۔۔

کہہ کے وہ رخ موڑ گئی۔۔۔۔

بچی کو بی بی کاٹ میں ڈالا

لے کے نیچے اترے اور چلنے لگے

چلتے چلتے وہ ایک قدرے سنسان سڑک پر پہنچے آنکھیں نم تھیں۔۔۔۔

ایک درخت کے ساتھ بی بی کاٹ کورکھا

سردیوں کی راتوں میں روڈ بالکل سنسان تھا
بچی خاموش سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی
آگے بڑھ کہ بچی کا ماتھا چوماتا تھا

وہ باپ کا لمس محسوس کر کے دھیرے سے مسکرائی تھی۔۔۔۔

والٹ میں لگی اپنی اور اس کی آخری تصویر تحفے کے طور پہ اس کے ساتھ رکھ دی تھی

شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر یہ زندہ بچ جائے تو انہیں ڈھونڈ لے۔۔۔۔

”ہمیں معاف کر دیجیئے گا بیٹا ہم آپ کی حفاظت نہیں کر پائے ہم مجبور تھے۔۔۔۔۔ لیکن ہم

آپ کو اللہ کے سپرد کر رہے ہیں وہ آپ کے لیے کوئی اچھا وسیلہ بنادیں۔۔۔۔۔

اس کا ننھا سا ہاتھ چھوڑ کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔

گاڑی میں بیٹھے گاڑی سٹارٹ کی

اس بچی نے ننھی گردن گھمائی شاید وہ اپنے باپ کو دیکھنا چاہتی تھی

اور زار و قطار رونے لگی
انہوں نے مڑ کے نہیں دیکھا تھا
یہ آوازیں آج بھی ان کے کان کے پردے پھاڑتی تھی۔۔۔۔
”پتہ نہیں وہ زندہ تھی یا مر گئی تھی“
وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔۔۔۔
وہ بس اتنا جانتے تھے وہ ان کی بیٹی تھی اور وہ ایک لاپرواہ باپ۔۔۔۔ جو اپنی اولاد کی حفاظت
نہ پائے۔۔۔۔
ان کی آنکھیں پھر ایک دفعہ بھگنے لگی تھی۔۔۔۔



چاہت لب پہ مچلتی ہوئی لڑکی کی طرح ہے
حسرت آنکھ میں زنداں کے آسیروں جیسی

صبح کی ذردروشنی نے اس چمچماتے کوٹھے پہ لگی بتیوں کو ماند کر دیا تھا۔۔۔۔۔

ہر کمرے میں چیخل پہل تھی

سوائے اس کے کمرے کے وہ ابھی تک افسردگی سے۔۔۔۔۔ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

ساتھ کمرے میں بیٹھی نگار بیگم یہ الفاظ سن کے حیرت کی تصویر بنی ہوئی تھی

فٹافٹ منہ سے پان تھوکا تھا

”خان جی آپ زرپاش کی بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے آگے ہو کے ایسے پوچھا جیسے۔۔۔۔۔ اس کے کانوں نے غلط سنا ہو۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اسی کی۔۔۔۔۔“

اس نے لا پرواہی سے کہا

”خان جی پورے کوٹھے میں جس بھی لڑکی پہ ہاتھ رکھیں گے لڑکی حاضر لیکن زرپاش نہیں

انہوں نے دو ٹوک کہا تھا۔۔۔۔۔

”کیوں اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔۔۔۔۔

”کیونکہ خان جی وہ طوائف نہیں ہے۔۔۔۔۔“

وہ کوٹھے میں رہتی ضرور ہے وہ طوائف نہیں ہے۔۔۔۔۔

اس کی ماں یہ نہیں ہونے دے گی

انہوں نے ساری صورتحال بتائی۔۔۔۔۔

نگار بیگم صرف ایک رات کی بات ہے۔۔۔۔۔” میں اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں

آپ کچھ کریں نا میں آپ کو اتنے پیسے دوں گا کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔۔۔۔۔

اس نے انہیں لالچ دی

معذرت۔۔۔۔۔ خان جی یہ قصہ ہمارے بس سے باہر ہے اس کی ماں نے ہماری بہت خدمت کی ہے کبھی ایک پھوٹی کوڑی نہیں لی ہم سے کہ بدلے میں ہم زراپاش کو دھندے سے دور رکھیں ہم زبان دے چکے ہیں اور نگار بیگم زبان سے نہیں پھرتی۔۔۔۔۔

زراپاش والی بات ممکن نہیں۔۔۔۔۔

انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہا اور پھر سے پان چبانے لگی

وہ ایک سخت نگاہ ان پہ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا

”میرا نام بھی میرے ماں باپ نے وہاج خان رکھا ہے نگار بیگم۔۔۔۔۔ اور میری بھی ضد ہے میں بھی زریپاش کے ساتھ وقت گزار کے رہوں گا چاہے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔۔۔۔۔

وہ تپش بھری نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا
نگار بیگم نے سر جھٹک دیا

لیکن وہ ابھی تک سوچ رہی تھی کہ اس نے زرخا کو دیکھا کہاں ہے۔۔۔۔؟



شام تنہائی ی غم نہ کر کہ

تیرا کوئی ی ہمسفر نہیں ہے ہم ہیں۔۔۔۔

جہاں آرا نک سک سی تیار ہوئی ی پریشانی سے ملازمین کو ہدایات دے رہی تھی

”زری کو بہت تیز بخار ہے۔۔۔۔۔ ہمارا جانا ضروری نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ جاتے آپ انھیں

وقت پہ دوائی یں دیتے رہی مے گا ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔“

بیڈ پہ آنکھیں موندے گہری نیند سوئی ی زری کے نقاہت زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں

نے پریشانی سے کہا

اور خود چادر اوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی ی

اور ملازمہ کو ہدایت دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔

ملازمہ نے بھی ان کی پیروی کی
اب کمرے میں زرباش اکیلی تھی



کتنے مغرور پہاڑوں کے بدن چاک ہوئے
تیز کرنوں کی جو بارش ہوئی تیروں جیسی۔۔۔۔
وہ غصے سے جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا چمکیلے پردے کے پار نظر پڑتے ہی ٹھٹکا۔۔۔۔
وہ اندر پلنگ پہ گہری نیند سو رہی تھی
وہ خود کو روک نہ پایا
اور اندر چلا گیا۔۔۔۔۔
وہ ابھی تک سو رہی تھی
اس کے پاس کھڑا ہو کے کافی دیر اسے دیکھتا رہا

وہ اسے اتنی معصوم لگی کہ بے ساختہ اس کے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا
وہ کسی کی موجودگی محسوس کر کے گھبرا کے اٹھ بیٹھی
دھند چھٹتے ہی۔۔۔۔۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ پھر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا
اسے بخار کی وجہ سے۔۔۔۔۔ بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی
پھر بھی اٹھ کھڑی ہوئی
اور کمرے سے باہر جانے لگی
جب کسی نے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کے اس کا راستہ روک لیا
”آپ مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہیں۔۔۔۔۔“
ذو معنی لہجے میں پوچھا گیا تھا
”ہمارا راستہ چھوڑیئے۔۔۔۔۔“
نظریں جھکا کے استفسار کیا گیا تھا

”ابھی کہاں۔۔۔۔۔“

وہ لاپرواہی سے کہہ کے دو قدم قریب آیا تھا

وہ دو قدم پیچھے ہوئی تھی

وہ دیوار کے ساتھ جا لگی تھی

اور اس نے دونوں بازو دیوار کے ساتھ لگا کے گھیرا تنگ کر لیا تھا

وہ سانس روکے کھڑی تھی۔۔۔۔۔

”جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی۔۔۔۔۔“

وہ بس رو دینے کو تیار تھی۔۔۔۔۔

نظریں ابھی تک جھکار کھی تھی

وہ لمبی پلکوں میں بھٹک کے رہ گیا تھا

”ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔“ نگار بیگم نے سارے جہاں کا حسن۔۔۔۔۔ اس کو ٹھٹھے میں چھپا

کے رکھا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے دھیرے سے کہا تھا

اس نے یکدم سر اٹھایا تھا

اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں

اس کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا

”جان لینے کا ارادہ رکھتی ہیں کیا۔۔۔۔۔؟“

بے ساختہ وہ کہہ بیٹھا تھا

”ہمیں جانے دیجیئے“

آواز بہت آہستہ تھی

وہ نازک پری اس کے چوڑے سینے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔۔۔۔۔

اب اس کی برداشت اتنی ہی تھی
وہ کھڑی بھی نہیں ہو پار ہی تھی
بخار گھبراہٹ کمزوری۔۔۔۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرہ چھا گیا
اور وہی زمین پہ بے ہوش ہو کے گرنے لگی تھی کہ اس نے تھام لیا
وہ بس اس نازک سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا
اسی لمحے اس کا فیصلہ بدل گیا تھا۔۔۔۔
خیال ضبط اور ترک تعلق
یہی پتھر بہت بھاری ہے اب تک

سورج کی کرنیں اب آہستہ آہستہ مدہم ہو رہی تھی شام کا سیاہ اندھیرہ روشنی ختم کرنے کو بے
تاب تھا آسمان پہ اڑتے پرندوں کی پروازوں میں تیزی آگئی تھی۔۔۔۔۔ درختوں کے

پتے ہو لے ہو لے لرز رہے تھے۔۔۔۔۔ ایسے میں اس کو ٹھٹھے کے اس چھوٹے کمرے میں
اسے بازوؤں میں تھامے وہاں کو پہلی دفعہ اپنی دھڑکنوں کا شور سنائی دیا تھا اسے محسوس ہوا
اس کا دل ابھی پنجرہ توڑ کے باہر نکل آئے گا ایک لمحے میں اسے محسوس ہوا کہ اس کا سارا غرور
خاک میں مل جائے گا وہ ابھی تک بے ہوش ساکت اس کی بانہوں میں جھول رہی تھی
وہ بس اسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا اسے خود اپنی حالت کی سمجھ نہیں آرہی تھی
اگلے ہی لمحے وہ اپنے حواسوں میں لوٹا اس کا نیچے کی طرف جھولتا ہاتھ جیسے ہی ہاتھ میں لیا اسے
محسوس ہوا وہ بخار میں تپ رہی تھی۔۔۔۔۔

اور اگلے ہی لمحے وہ اسے سہارہ دے کے بستر تک لے کے گیا اسے لٹایا کمبل درست کیا
”زری ”جہاں آرا بیگم چلی گئی کیا؟“

اسی لمحے رانی تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوئی ی تھی
لٹھ کو انگلی پہ لپیٹتی وہ چونک کے وہی کھڑی ہو گئی تھی

وہاں موجود شخص کی اس کی طرف پیٹھ تھی لیکن پھر بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہے۔۔۔۔؟

”خان جی ”آپ یہاں؟“

اس نے وہی کھڑے کھڑے کہا

اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ حسد نمایاں تھی

”وہ یکدم پلٹا

اسے ایک نظر دیکھا

لیکن اس کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی

”وہ میں یہاں سے گزر رہا تھا دیکھا یہ نیچے زمین پہ بے ہوش پڑی تھی

اس نے ایک نظر بیڈ پہ لیٹی زرپاش کو دیکھا اور سہولت سے جھوٹ بولا

پتہ نہیں کیوں وہ نہیں چاہتا تھا یہاں کوئی اس کے کردار پہ بات کرے

لیکن دروازے میں کھڑی رانی کھوجتی ہوئی ی نظروں سے ابھی تک وہاں کو دیکھ رہی تھی
”ایسے کیا کھڑی ہو۔۔۔۔۔“؟ یہ بے ہوش ہے جاؤ ڈاکٹر کو فون کرو یا ٹھنڈی پٹیاں
رکھو۔۔۔۔۔“

اسے یوں کھڑا دیکھ کہ وہ چڑ گیا اسی لیے اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا
”آپ جائی یئے خان جی۔۔۔۔۔ میں دیکھ لوں گی اس کی ماں واپس آگئی تو بہت ہنگامہ ہو
گا۔۔۔۔۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھی وہاں کے پاس سے گزر کے بیڈ پہ بے ہوش پڑی زریا کی طرف
بڑھی

لہجے میں جلن کی جگہ اب غصے نے لے لی تھی
”کیوں۔۔۔۔۔“؟ اس کی ماں مجھے کیا کہے گی۔۔۔۔۔؟
اس نے ابرو اچکا کے سوالیہ لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کچھ نہیں جانتے خان جی۔۔۔۔۔“

وہ ایک ادا سے مڑی تھی

مکار ہنسی چہرے پہ سجائے پٹی تھی۔۔۔۔۔

اس نے ایک نظر رانی کو دیکھا تھا پھر رخ موڑ گیا تھا

وہ جانتا تھا رانی اس میں دلچسپی رکھتی ہے وہ اپنے کسی بھی عمل سے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ

وہ زرباش میں دلچسپی رکھتا ہے

کیونکہ ابھی زرباش نے رانی کے ساتھ ہی رہنا تھا

”اچھا ٹھیک ہے تم سنبھال لو۔۔۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔“

وہ کندھے اچکا کے برے دل کے ساتھ لا پرواہی کا اظہار کرتا آگے بڑھ گیا

رانی کی تیز نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا

وہاں نے پلٹ کے بیڈ پہ لیٹی زرباش کو دیکھا تھا اور پھر ایک نظر خود کو گھورتی رانی پہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔۔۔۔

ذہن اس کا ابھی تک زرباش میں الجھا ہوا تھا

اب کمرے میں صرف رانی اور بیڈ پہ بے ہوش پڑی زرباش تھی

”ہوں خان جی یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کچھ بھی کہیں گے اور ہم یقین کر لیں گے ساری عمر

مردوں میں ہی گزاری ہے چلتا مرد دیکھ کہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا

ہے۔۔۔۔ اگر جہاں آرا کے احسان یاد نہ ہوتے تو اس کو ابھی ہی زہر دے کے یہاں مرنے

کے لیے چھوڑ دیتی۔۔۔۔ لیکن نہیں میری جان ہم کیوں اپنی ذندگی خراب کریں۔۔۔۔۔ ان

کی کیوں نہ کریں جنہوں نے ہمیں ٹھکرایا۔۔۔۔۔ ایسی موت تو بہت آسان ہوتی ہے

زری۔۔۔۔۔ ہم آپ کو تڑپنے والی موت دیں گے۔۔۔۔۔“

وہ گلاس میں پانی انڈیتے ہوئے زہر خند لہجے میں بڑبڑائی ی اس کے لہجے میں سانپ جیسی زہر
تھی۔۔۔۔۔ جیسے وہ ڈنگ مارنے کو تیار ہو۔۔۔۔۔

الماری کھولی پٹیاں نکالی اور اس کے ماتھے پہ رکھنے لگی تھوڑی ہی دیر میں زرپاش کو ہوش آگیا تھا
زرپاش نے آنکھیں کھولی تو اسے دھندلا دھندلا دیکھائی دی دینے لگا
پاس چمکیلی قمیض نیچے سلک کی شلوار پہنے رانی کھڑی تھی
کھلے بالوں کو شانوں پہ پھیلا رکھا تھا

آنکھوں میں کاٹ اور چہرے پہ مصنوعی مسکراہٹ سجا رکھی تھی
وہ جیسے جیسے ہوش میں آتی گئی پرانے منظر کسی فلم کی طرح اس کے ذہن میں چلنے
لگے۔۔۔۔۔

رانی یہاں کیا کر رہی ہے۔۔۔۔۔ ”؟ اور وہ کہاں ہیں۔۔۔۔۔“
”کیا رانی نے ہمیں اس کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔۔۔۔۔“

ایسے بہت سے سوال ذہن میں گردش کر رہی تھی
لیکن وہ کچھ پوچھ نہیں پارہی تھی
”ارے زری آپ کو ہوش آگیا کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ۔۔۔۔“
وہ مصنوعی محبت لہجے میں سمو کے اس کی طرف بڑھی
اس کے قریب بیٹھ کے اس کے بالوں کو سنوارنے لگی
اس نے ایک نظر رانی کو دیکھا
وہ اسے ہمیشہ سے اپنی بہن کی طرح سمجھتی تھی
اس لیے اس کی قربت پا کے رونے لگی۔۔۔۔
”رانی نے کچھ چونک کے اسے دیکھا
”کیا ہوا زری“ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔۔۔؟“
وہ سنبھل کے بیٹھی

”ہاں ہم ٹھیک ہیں۔۔۔“

اس نے یکدم اپنی آنکھیں پونچھ ڈالی
دونوں کہنیوں کے سہارے اٹھ کے بیٹھ گئی

”پکانا۔۔۔“

اس نے تصدیق چاہی۔۔۔

”ہاں۔۔۔“

وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔۔۔

”ویسے زری اگر آپ برانہ مانیں تو ایک بات پوچھیں۔۔۔“؟

وہ گلا کھنکار کے مدعے کی بات پر آئی

کوٹھے میں باتیں ہو رہی ہیں کے بڑی حویلی کے وہاج خان کی آپ پر بری نظر ہے۔۔۔۔۔“؟

اس نے کمال خوشیاری سے اسے کھوجنا چاہا

اس نے ایک دم گڑبڑا کے رانی کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔“

وہ اپنی صفائی میں ٹھیک طرح سے بول بھی نہ پائی۔۔۔۔۔

اور وہ سمجھ گئی تھی

دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔۔۔۔۔

”ویسے زری ہمارا کام تو نہیں بنتا۔۔۔۔۔ پھر بھی ایک بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے آپ کو

ایک بات سمجھانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے معصومیت سے کہا

”مرد تو یوں بھی قابل اعتبار نہیں ہوتے اور کوٹھے میں آنے والے مرد تو بالکل بھی قابل

اعتبار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ تم خود سوچو زری جو مرد باکردار نہیں ہے وہ قابل اعتبار کیسے ہو سکتا

ہے۔۔۔۔۔”؟ جو مرد طوائف کے کوٹھے میں دل بھلانے آتا ہے وہ کبھی بھی کسی طوائف

کے ساتھ دل لگا نہیں سکتا۔۔۔۔۔ ان مردوں کی باتوں میں کبھی مت آنا۔۔۔۔۔“

وہ اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے اسے رسان سے سمجھا رہی تھی

اور وہ کسی کٹ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پہ چل رہی تھی

اس کی کہی ہوئی باتوں کو سوچ رہی تھی

”ادھر ہماری طرف دیکھیں۔۔۔۔۔“

یہ مرد جو ہوتے ہیں نایہ تین طرح کے جال پھینکتے ہیں۔۔۔۔۔

پہلا جال چاہت کا۔۔۔۔۔

وہ انگلیوں پہ گن کے بتانے لگی

دوسرا جال محبت کا

اس نے درمیانی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا

وہ دم سادھے سن رہی تھی
اور اگر عورت ان دونوں جالوں میں نہ پھنسے تو۔۔۔
وہ شاطر نگاہیں اس پہ گاڑتی اس کے تھوڑے قریب ہو کے رازداری سے بولی۔۔۔
وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی
اور پھر وہ تیسرا اور سب سے آخری جال نکاح کا پھینکتا ہے۔۔۔۔
اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لفظ ”نکاح“ پہ زور دے کے کہا۔۔۔
وہ الجھی ہوئی نظروں سے رانی کو دیکھ کے رہ گئی۔۔۔
”لیکن رانی جی نکاح کا رشتہ تو اللہ نے بنایا ہے۔۔۔۔“
وہ نا سمجھی سے بولی

”بے شک میری جان۔۔۔۔۔ بنایا تو خدا نے ہے لیکن۔۔۔۔۔ لیکن مردوں نے اس کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے مرد روح کو کہاں سمجھتا ہے وہ تو جسم کو دیکھتا ہے اسے روح سے کوئی سروکار نہیں ہوتا وہ جسم کا پجاری ہے تب ہی تو کوٹھے آباد ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے ایک ادا سے کہا لہجے میں افسوس بھی بھر آیا
عورت کو۔۔۔۔۔ خود کو طاقتور بنانا چاہیئے۔۔۔۔۔ اس کو اپنی ضرورتوں کے لیے اپنی عزت کو قربان نہیں کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔ ”اسے مرد کے نکاح کے جھانسنے میں نہیں آنا چاہیئے۔۔۔۔۔“

وہ جیسے اسے کسی اور ہی دنیا میں لے گئی تھی
جہاں عورت ایک معصوم پرندہ اور مرد ایک ظالم شکاری تھا
”زیرپاش۔۔۔۔۔“

کسی کے پکارنے پہ وہ جیسے اس دنیا میں واپس لوٹی

دروازے میں اس کی چادر اوڑھے اس کی ماں کھڑی تھی۔۔۔

چہرے پہ فکر مندی کے آثار تھے

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی بخار اتر آپ کا۔۔۔۔۔؟“

وہ آگے بڑھی چادر وہی بیڈ پہ پھینک کے زری کی طرف لپکی اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا

”یا اللہ تیرا شکر۔۔۔۔۔“ بخار اتر گیا۔۔۔۔۔“

وہ تشکرانہ لہجے میں بولی

لمبا سانس لے کے وہی پلنگ پہ زری کے قریب بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”وہ دھیرے سے مسکرا دی۔۔۔۔۔“

”اچھا میں چلتی ہوں۔۔۔۔۔“

رانی اٹھ کھڑی ہوئی

زری اس کی طرف دیکھ کے مسکرائی

وہ بھی مسکرا دی

وہ ہر نی جیسی چال لیتی دروازے تک گئی پھر ایک نظر پلٹ کے پلنگ پہ اپنی ماں کے ساتھ
باتیں کرتی زری کو دیکھا اور پلٹ گئی۔۔۔۔

اب پیچھے زری کے ذہن میں رانی کی باتیں ہی گردش کر رہی تھی
”کہتے ہیں دشمن اپنا پہلا وار کرتا ہی دماغ پہ ہے دماغ کو مفلوج کرنے کے بعد ہی وہ جسم پر حملہ
کرتا ہے کیونکہ جب تک دماغ کام کرتا رہتا ہے دشمن کی جیت کے امکان صفر فی صد ہوتے
ہیں۔۔۔۔۔“

رانی نے بھی یہی کیا تھا

اب مطمئن سی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی
اور اندر بیٹھی زری پاش یہ سوچ رہی تھی
کہ اپنی ماں کو بتا دے یا نہیں

وہ کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ پارہی تھی



جاؤ جیت کا جشن مناؤ

میں جھوٹا ہوں تم سچے ہو۔۔۔۔۔

صبح کی مدہم روشنی نے دھیرے دھیرے اس کوٹھے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا

تھا۔۔۔۔۔ رات کا ملحی اندھیرہ اس وقت بھی باقی تھا کیونکہ آسمان پہ کالے بادلوں کا راج تھا

۔۔۔۔۔ مینہ برسنے کو بے قرار تھا۔۔۔۔۔ صبح کے دس بجے بھی رات کا گمان ہوتا تھا

ایسے میں کوٹھے کی تمام بتیاں روشن تھی۔۔۔۔۔

آج کوٹھے میں کوئی رقص نہیں رکھوایا گیا تھا۔۔۔۔۔

موسم کی خرابی اور طوائی فوں کی تھکاوٹ بنیادی وجہ تھی

اس لیے آج کوٹھے میں گہما گہمی کم تھی۔۔۔۔۔

وہ سفید رنگ کی قمیض شلوار زیب تن کیے۔۔۔۔۔ کھلے بال کمر پہ پھیلے گھٹنوں کو باہم ملائے اوپر
تھوڑی ٹکا کر بے زار سی بیٹھی کھڑکی سے باہر بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھ رہی تھی
جہاں آرا کوٹھے کے آخری حصے میں نئی آنے والی لڑکیوں کو رقص سکھا رہی تھی
اور زرباش کے کمرے کے ساتھ ہی نگار بیگم۔۔۔۔۔ چمکیلی ساڑھی زیب تن کیے اونچا جوڑہ
کیے میک اپ سے اٹے چہرے کے ساتھ ورطہ حیرت میں ڈوبی سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی
تھی۔۔۔۔۔

”آپ کو پتہ ہے۔۔۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“
وہ تھوڑا آگے کی طرف سر کی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بے یقینی سے بولی۔۔۔۔۔
اسی لمحے وہ پلنگ سے اتری۔۔۔۔۔ اور کمرے سے باہر نکلی۔۔۔۔۔
رخ رانی کے کمرے کی طرف تھا
اسی لمحے شناسا آواز کانوں سے ٹکرائی تھی

اور اس کے قدم وہی تھم گئے

”میں زرباش سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ نگار بیگم۔۔۔۔۔

وہاں کے یہ الفاظ کسی بم کی طرح ان کی سماعتوں پہ گرے۔۔۔۔۔ اور دروازے کے ساتھ لگ

کہ کھڑی زرباش۔۔۔۔۔ نے بے یقینی سے یہ الفاظ سنے تھے۔۔۔۔۔

”خان جی پاگل ہو گئے ہیں کیا۔۔۔۔۔“ آپ اتنی بڑی حویلی کے خان ہیں آپ ایک

طوائف کی بیٹی سے شادی کریں گے۔۔۔۔۔؟“

منہ سے پان تھوک کے اس بھدے ہوئے جسم والی خاتون نے برا سامنہ بنا کہ کہا تھا۔۔۔۔۔

اور باہر کھڑی زرباش سانس روکے سن رہی تھی

”آپ سے مشورہ نہیں مانگا۔۔۔۔۔ بس یہ کہہ رہا ہوں کہ زرباش کا مجھ سے نکاح کروا

دیں۔۔۔۔۔“

وہ ابھی بھی اپنی بات پہ باضد تھابت ہی بگڑ کر بولا تھا۔۔۔۔۔

”پیسوں کی فکر مت کریں جتنے کہیں گے دے دوں گا بس وہ مجھے کسی قیمت پہ بھی وہ
چاہیئے۔۔۔۔۔“

وہ دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اٹھنے لگا

جب دھڑام سے دروازہ کھلنے پہ وہ چونکا

سامنے لال چہرہ لیے وہ کھڑی اسے گھور رہی تھی۔۔۔۔

”خان جی۔۔۔۔۔ آپ کون ہوتے ہیں میری قیمت لگانے والے۔۔۔۔۔ کوٹھے پہ ضرور ہوتی

ہوں طوائف کی بیٹی ضرور ہوں لیکن بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ خریدار آئی ہیں اور قیمت

لگائی ہیں اور دل بھلائی ہیں۔۔۔۔۔“

وہ چبھتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی

وہ بس چہرے پہ بے زاری سجائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔۔۔۔۔

”میں قیمت نہیں لگا رہا تمہاری نکاح کر کے لے کے جاؤں گا زیادہ باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔۔۔۔“

وہ اسے سختی سے ٹوکتا جانے لگا۔۔۔۔

”اپنا دل بھلانے کے لیے۔۔۔۔۔ نکاح کو بھی بدنام نہ کریں۔۔۔۔۔ جانتی ہوں آپ جیسے برائے نام عزت دار کو ٹھوں پہ آتے ہیں دل بھلاتے ہیں قیمت لگاتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر چھوڑ دیتے ہیں اور آپ تو اتنے گھٹیا ہیں کہ۔۔۔۔۔“

ابھی وہ اتنا ہی بول پائی ی تھی۔۔۔۔۔

جب وہ غصے سے پلٹا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب کرنا چاہا۔۔۔۔۔ کہ زوردار تھپڑ اس کا خون تک گرما گیا۔۔۔۔۔ وہ بے یقینی سے لال آنکھوں سے اسے دیکھے گیا

نگار بیگم جو ابھی تک خاموش تماشا ہی تھی

بات بگڑتی دیکھ کہ۔۔۔۔۔ زر پاش کو جھڑکنے لگی

”طوائف کے کوٹھے میں رہتی ضرور ہوں لیکن طوائف نہیں ہوں میں۔۔۔۔۔۔ کہ جب جس کا دل چاہے دل بھلائے۔۔۔۔۔۔ قیمت لگائے۔۔۔۔۔۔ آئی نہ مجھے چھونے کی کوشش مت کیجیئے گا۔۔۔۔۔۔“

اور تیزی سے باہر نکل گئی۔۔۔

وہ لال بھجھو کا چہرہ لیے اسے جاتا دیکھتا رہا۔۔۔۔۔

”خان جی جانے دیجی مے۔۔۔۔ آپ کیا دل لگا بیٹھے ہیں۔۔۔۔ دل بہلائی پے۔۔۔۔ اور

بھی خوبصورت لڑکیاں ہیں میرے پاس

”نگار بیگم بات سنجانے کی غرض سے بولی۔۔۔

”نہیں اب میری ضد میرا جنون ہے میں۔۔۔۔۔ اس کا یہ غرور توڑا گا۔۔۔۔۔ کہ یہ

طوائف کہ کوٹھے میں رہ کہ بھی طوائف نہیں ہے میں بناؤں گا اس کو

طوائف۔۔۔۔۔ اور میں لگاؤں گا اس کی قیمت اس نے وہاج خان کو تھپڑ مارا ہے اس کا

حساب اسے آخری سانس تک دینا ہو گا۔۔۔۔۔ واقعی کوٹھے میں رہنے والی بیوی نہیں بنتی وہ
طوائف ہوتی ہے اور طوائف بھی رہتی ہے۔۔۔۔۔“
وہ دھاڑتے ہوئے غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

لیکن یہاں سننے والا کون تھا
جس نے سننا تھا وہ جاچکی تھی

وہ زرباش سے کم از کام زرباش سے ایسی توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی وہ آج پہلے والی
ڈری سہمی زرباش نہیں تھی یہ تو کوئی اور ہی تھی

وہ ابھی تک بپھرے ہوئے شیر کی طرح لال بھبھو کا چہرہ لیے کھڑا تھا

اور اس نے تیزی سے اندر جا کے کمرے کو کنڈی چڑھائی اور وہی دیوار کے ساتھ لگ کے
اپنا رکا ہوئے سانس بحال کرنے لگی وہ نہیں جانتی تھی آگے کیا ہو گا۔۔۔۔۔؟“

اسی لمحے دروازہ زور سے بجاوہ ڈر کے مارے اور سمٹ کے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”ذری دروازہ کھولیں۔۔۔۔“

جہاں آرا کی آواز سن کے اسے کچھ حوصلہ ہوا۔۔۔۔۔ اس نے تیزی سے دروازہ
کھولا۔۔۔۔

اور ان کے گلے لگ کے زار و قطار رونے لگی۔۔۔۔
وہ گھبرا گئی تھی

اور زری نے اسے لمحے انہیں سب بتا دیا تھا۔۔۔۔۔
وہ حیرت زدہ سی وہی کھڑی رہی

پھر بولی تو فقط اتنا

”آپ پریشان نہ ہو ہم نگار بیگم کو جانتے ہیں وہ مر سکتی ہیں لیکن وعدہ خلافی نہیں کر سکتی
انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا

پتہ نہیں وہ مطمئن ہوئی تھی یا نہیں لیکن جہاں آرا اب بہت پریشان نظر آرہی تھی

جن نظروں سے اتنی سال انہوں نے اپنی بیٹی کو بچایا تھا وہ ابھی انہی نظروں کی زد میں تھی
اور اسی لمحے نگار بیگم کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ دل میں بھڑکتی بدلے کی آگ لے کے
اس کو ٹھٹھے سے نکلاتھا

اسے زرباش کو حاصل کرنا تھا یہ اب اس کی ضد تھی۔۔۔۔
اور زرباش کسی قیمت پہ اسے قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔
اور یہ صبح دھیرے دھیرے سرک رہی تھی



گزر رہی ہیں گلی سے پھر تیز ہو آئی یں
کو ار کھو لو دیئے بجھاؤ اداس لو گو۔۔۔۔

اپنے اندر دکھ تکلیف پریشانیاں سموئے صبح کی روشنی مدہم ہونے لگی اور رات کے اندھیرے
نے کمال خوشیاری سے اس روشنی کو ختم کیا۔۔۔۔۔ سورج چپکے سے نظریں چرا کے چھپ کے

بیٹھا تھا اور چاند محو تماشہ تھا ایسے میں وہ تاروں کے ساتھ ڈھکے ہوئے آسمان کے نیچے بیٹھی
تھی۔۔۔۔۔ آدھی آستینوں والی سفید قمیض نیچے چوڑی دارپا جامہ پہنے وہ زمین پہ بیٹھی تھی
سر پہ چاندی اتر آئی تھی چہرے پہ ہلکی ہلکی جھریاں بھی جنہیں وہ میک اپ سے چھپاتی تھی
اور آج بھی سولہ سترہ سال کی لڑکی لگتی تھی
آنکھوں میں صدیوں کی ریاضت تھی۔۔۔۔۔ اور چہرے پہ تھکان۔۔۔۔۔
”وہ جہاں آرا تھی اس نے ایک شاندار وقت گزارا تھا اپنے وقت کی سب سے مشہور
طوائف جو زمین پہ رقص کرتی تھی تو آسمان جھومنے لگتا تھا۔۔۔۔۔ لوگ اس کی ایک جھلک
کو ترستے تھے۔۔۔۔۔ وہ تب تک جہاں آرا تھی جب تک وہ ماں نہیں تھی اور جب وہ ماں بنی
تو ماں بن کے ہی رہ گئی اس دن جہاں آرا کہیں کھوگئی تھی
بس اس دن صرف زری کی ماں بچی تھی
انہیں آج بھی وہ دن یاد تھا جب۔۔۔۔۔ وہ رات کو لیٹ کسی شو سے واپس آرہی تھی

انہوں نے کسی بچی کے رونے کی آواز سنی تھی وہ تڑپ کے رہ گئی تھی
وہ ایک عام عورت تھی لیکن بچی کی چیخ و پکار نے اس کے سوئے ہوئے احساسات جگادیئے تھے
”فورا گاڑی روکو۔۔۔۔۔“

سختی سے ڈرائی پور کورکنے کا کہہ کر وہ دوپٹہ سیٹ کر کے گاڑی سے اتری تھی
آواز کے تعاقب میں گئی
انہیں پیڑ کے نیچے بے بی کاٹ میں ایک نومولود خوبصورت بچی روتی ہوئی نظر
آئی۔۔۔۔۔

انہوں نے فوراً اسے گود میں بھر لیا
بچی فوراً خاموش ہوئی اور اسے دیکھنے لگی
جہاں آرا نے نظریں گھما کے یہاں وہاں دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا

انہیں محسوس ہوا کہ کہیں یہ اغوا کار کوئی ی گینگ نہ ہو ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا
کے بچی کو واپس رکھ دیں پھر اس کے معصوم چہرے کو دیکھا تو یہ نا کر سکتی
یکدم ان کی نظر زمین پہ الٹی پڑی تصویر پہ پڑی جس پہ sorry beta کے حروف لکھے دیکھ
کہ وہ چونکی۔۔۔۔۔

جھک کے تصویر اٹھائی جو کسی مرد کی تھی اور ساتھ یہی بچی
معاملہ انہیں کچھ سمجھ آ گیا تھا

وہ چپ چاپ بچی کو لے کے کوٹھے پہ لے آئی تھی
انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ نگار بیگم نے کتنا ہنگامہ کیا تھا
تب ان کے قدموں میں بیٹھ کے انہوں نے درخواست کی تھی اور پوری زندگی خدمت کا وعدہ
کیا تھا

تب زرباش کو اس کوٹھے میں جگہ ملی تھی

وہ چاہتی تو تھانے میں تصویر دیتی بچی کو باپ سے ملوادی لیکن اس لمحے وہ خود غرض ہو گئی تھی

تب انہوں نے اس کا نام زرباش رکھا تھا۔۔۔۔۔ جس کا مطلب ہے بہت خوبصورت۔۔۔۔۔ اور وہ تھی بھی بہت خوبصورت۔۔۔۔۔

اور یوں وہ اس کوٹھے میں پلی بڑھی تھی

اور یوں سب ایک دم ختم ہو رہا تھا

وہ جانتی تھی ان کے بعد اس کوٹھے میں زرباش کا کوئی ی نہیں تھا

وہ اٹھی سیڑھیاں اتر کر کمرے میں گئی

زرباش گھری نیند سو رہی تھی

دراز کھولا فائل نکالی۔۔۔۔۔

وہ بیماری کی رپورٹس تھی

انہیں بلڈ کینسر تھا۔۔۔

ان کے پاس وقت بہت کم تھا

اور اب وقت فیصلے کا تھا

انہوں نے ایک نظر سوتی ہوئی ی زرپاش کو دیکھا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔۔۔۔۔



اتنے خائف کیوں رہتی ہو

ہر آہٹ سے ڈر جاتے ہو۔۔۔۔۔

اگلی صبح امید روشنی دکھ مایوسی ضد اور افسوس لے کے اتری تھی۔۔۔۔۔

جہاں آرا کی طبیعت خراب تھی وہ۔۔۔۔۔ کمرے میں سو رہی تھی۔۔۔۔۔ زرپاش اپنے

کمرے میں اکیلی تھی

نگار بیگم لڑکیوں کو ہدایات دے رہی تھی

اسی لمحے وہ۔۔۔۔۔ تیزی سے کوٹھے کے اندر داخل ہوا تھا

اس کا غصہ ابھی بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا

وہ سیدھا زری کے کمرے میں آیا تھا۔۔۔۔۔

وہ کھلے بال شانوں پہ پھیلائے سابقہ لباس میں شیشے کے سامنے کھڑی کنگی کرنے میں مصروف تھی۔۔۔۔۔

یکدم کنگی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گر گئی۔۔۔۔۔

آئی نے میں وہ دیکھ سکتی تھی وہ پیچھے کھڑا تھا

اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا

وہ ہولے سے مسکرا کے وہی پلنگ پہ بیٹھ گیا

سنو ایک طوائف پہ اتنا غرور نہیں جتنا۔۔۔۔۔

وہ اس کے قریب بیٹھ کہ آنکھوں میں ترخم لے کہ اسے دیکھ رہا تھا

لہجے میں تمسخر نمایاں تھا

وہ نظریں جھکائے بھی اس کے لہجے میں ذلت محسوس کر سکتی تھی۔۔۔۔

”میں طوائف نہیں ہوں۔۔۔۔۔“ ”تم میری قیمت نہیں لگا سکتے۔۔۔۔۔“

وہ برہمی سے کہنے لگی

وہ وہی بیٹھا اس پری پیکر لڑکی کو دیکھنے لگا۔۔۔۔

جو غصے میں بھی خوبصورت لگ رہی تھی

کوٹھے میں رہنے والی طوائف ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میری جان شاید یہ تمہیں کسی نے بتایا

نہیں۔۔۔۔۔؟

وہ لاپرواہی سے کہتا ہوا اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔

”میں کوٹھے پہ رہتی ضرور ہوں لیکن میں طوائف نہیں ہوں میری قسمت مجھے یہاں لے

آئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں نے آج تک کسی کے سامنے رقص نہیں کیا

وہ روہانسی ہوتے ہوئے کمزور لہجے میں بولی۔۔۔۔۔

اسے ایک سیکنڈ کے لیے سامنے کھڑی اس لڑکی پہ ترس آیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اسے وہ طمانچہ یاد آیا تھا جو اس نے اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔۔۔۔۔

”ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے تم نے کسی کے سامنے رقص نہیں کیا نا تم کو ٹھے میں رہتے ہوئے بھی طوائف نہیں ہونا تمہاری آج تک کسی نے قیمت نہیں لگائی تمہیں اس بات پہ غرور ہے نا۔۔۔۔۔

اس نے کچھ اتنے زور سے اس کا بازو پکڑا کہ چوڑیاں ٹوٹ کہ اس کا بازو اور وہاں کا ہاتھ بھی زخمی کر گئی تھی

اس کی آنکھوں میں درد کے مارے پانی جمع ہونے لگا۔۔۔۔۔

اور وہاں کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا

”میری ایک بات کان کھول کے سن لو اب تم رقص بھی کرو گی اور تمہاری قیمت بھی لگے گی

----- اور تمہاری قیمت میں لگاؤں گا۔۔۔۔۔ اب تمہیں وہاں خان پہ ہاتھ اٹھانے کا
انجام پتہ چلے گا۔۔۔۔۔ اور تمہیں بتاؤں گا کوٹھے پہ رہنے والی عورت اگر رقص نہ بھی
کرے تو وہ طوائف ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تیار رہنا اس تھپڑ کی قیمت تمہیں چکانے پڑے
گی۔۔۔۔۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کے وہ تیزی سے باہر نکل گیا
اور وہ بے بسی سے اس جنونی انسان کو دیکھ کہ رہ گئی۔۔۔۔۔



محسن تم بدنام بہت ہو۔۔۔۔۔

جیسے ہو پھر بھی اچھے ہو۔۔۔۔۔“

صبح کی ریشمی کرنیں دھیرے دھیرے اس پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔۔۔۔۔ آسمان آج صاف تھا چوڑے آسمان کے سینے پہ سورج چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ لمبے گھنے اس پرانے درخت پہ پرندوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔۔۔۔۔ جو سہمی ہوئی آوازیں نکال کے اس سناٹے کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے

اس بڑی حویلی میں معمول کے مطابق چہل پہل تھی نیچے اس بڑے سے ہال میں صوفے پہ میر داد خان کچھ لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے سفید کاٹن کے سوٹ میں چوڑی پیشانی والے وہ بزرگ اس عمر میں بھی خوب رو لگتے تھے آدھا سر کالا اور آدھا سفید تھا داڑھی کے بالوں میں بھی چاندی اتر آئی تھی لیکن آج بھی وہی رعب باقی تھا پورے گھر میں ہر انسان ان سے بات کرنے سے خوف کھاتا تھا سوائے وہاج کے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ اس خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ تھا ابھی بھی وہ تیسری بار ملازم کے ہاتھ بلاوا بھیج چکے تھے۔۔۔۔۔

لیکن وہ یہاں نہیں آیا تھا

پہنے ہی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا

وہاں بیٹھے دو اجنبی چہروں نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا

اور میرا دل حجابِ حیات سے مسکرائے تھے

پھر سیڑھیوں سے اترتے وہاں کو افسوس سے دیکھا تھا

پتہ نہیں وہ اتنا صاف گو تھا یا انہیں چڑانے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا تھا۔۔۔۔۔

وہ اب ان کے سر پہ پہنچ آیا تھا

وہ ایک نظر اسے دیکھ کے پھر میر داد کی طرف متوجہ ہوگئے تھے

وہ بھی سر جھٹک کے صوفیہ بیٹھ گیا تھا

وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس دو کم عمر نوجوان حلیے سے کوئی ریپورٹر لگتے تھے

”شہباز خان اور رجب خان کسی کام سے دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے

اسی لیے میرداد نے وہاں کو میڈیا کے سامنے کیا۔۔۔۔۔

حالانکہ اچھائی کی امید انہیں اس کے ساتھ کبھی بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔

اور اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا

”تو خان جی۔۔۔۔۔ آپ گاؤں کے بڑے ہیں اور گاؤں کے لوگوں کے خیر خواہ بھی

ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں لگتا ہے آپ سے بڑھ کے کوئی بھی گاؤں کے مسائیل کو حل کرنے میں

ہماری مدد نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“

کیمرہ سیٹ ہوا تھا۔۔۔۔۔

اس ریپورٹر نے مسکرا کے انٹرویو کا آغاز کیا تھا

میرداد خان نے مسکرا کے محض سر ہلادیا تھا۔۔۔۔۔

وہ بوریت سے کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔۔۔۔۔

پھر سیدھا ہو کے بیٹھا۔۔۔۔۔

”ایسی محفلوں میں میرا کیا کام ہے ویسے۔۔۔۔۔؟“

اس نے لا پرواہی سے کہا۔۔۔۔۔

تو تینوں نے چونک کے وہاں کی طرف دیکھا تھا

جو بور سا لگتا تھا۔۔۔۔۔

اب کی بار میرداد کی نظروں میں غصہ تھا۔۔۔۔۔

”کیوں میرداد خان کے بعد آپ نے ہی اپنے والد صاحب کے ساتھ مل کے گاؤں کی بھاگ

دوڑ سنبھالنی ہے۔۔۔۔۔“

رپورٹر تذبذب کا شکار تھا۔۔۔۔۔

”مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔“

اس نے نیوز رپورٹر کے قریب ہو کے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا
”وجہ جان سکتا ہوں وہاں صاحب۔۔۔۔۔؟“

گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔۔۔۔۔ رپورٹر اس دفعہ ریٹنگ کے لیے قدرے دلچسپی سے اس کی
طرف پلٹا۔۔۔۔۔

پروگرام لائیو جا رہا تھا

اور میرداد سوائے ماتھے سے پسینہ صاف کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔۔۔۔۔
”میں آپ کو بھی بتانے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔۔۔۔۔“

اس نے مسکرا کے جواب دیا تھا

رپورٹر یکدم شرمندہ ہو کے میرداد کی طرف پلٹا تھا

”تو ہم کیا بات کر رہے تھے۔۔۔۔۔ خان جی۔۔۔۔۔؟“

اس نے مائی یک درست کرتے ہوئے سوال پوچھنا چاہا۔۔۔۔۔

”میں یہاں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر یہاں پیداوری کی شرح زیادہ ہے تو یہاں غربت کی شرح بھی زیادہ ہے اتنی محنت کے باوجود اگر یہاں کے لوگوں کو دو وقت کی روٹی نہیں مل رہی تو۔۔۔۔ کیا میں یہ سوال پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں کے لوگوں کی محنت سے جو فنڈز ملتے ہیں کیا وہ ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی نہیں ہے۔۔۔۔“

رپورٹر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا

اس سے پہلے کہ میرا داد خان کچھ کہتے وہاں نے ان کی بات کاٹ دی۔۔۔۔

”میں اس بات کا جواب دینا چاہتا ہوں

مسکرا کے کہا گیا تھا تو رپورٹر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔۔۔۔

”آپ یقیناً حیران ہونگے کہ میں ایک وڈیرہ ہونے کے باوجود اس نظام کے خلاف ہوں لیکن

میں اس نظام کے خلاف ہوں۔۔۔۔“

اس کے اس قدر اطمینان سے کہنے پر میرا داد نے افسوس سے سراٹھا کے دیکھا تھا۔۔۔۔

رپورٹر البتہ مائی یک ہاتھ میں پکڑے۔۔۔۔۔ دلچسپی سے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کیا ہم لوگ پاگل ہیں بے وقوف ہیں آنکھیں نہیں رکھتے یاد رکھنے کے باوجود اسے جھٹلاتے ہیں کیا حکومت کرنے کے لیے ایک اد کوئی دوسرے ملک کی ڈگری سیاسی بیک گراؤنڈ آٹھ دس گاڈز ہونے ضروری ہیں۔۔۔۔۔“ آپ کیا سمجھتے ہیں ایک عام کسان ان پڑھے لکھے لوگوں پہ حکومت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“

وہ تیزی سے مگر صاف گوئی سے کہہ رہا تھا

اور میرداد بس اسے دیکھ کہ رہ گئے تھے

وہ ایسا کیوں تھا وہ کبھی سمجھ نہیں پائے تھے۔۔۔۔۔

”میرے نزدیک امیروں کی بھیس میں چھپے ان وڈیروں جاگیرداروں حکمرانوں سے زیادہ اچھی

حکومت ایک عام شہری کر سکتا ہے۔۔۔۔۔“ کیونکہ اس کو کوئی چیز تھالی میں سجا کے نہیں

ملتی۔۔۔۔۔ اس کا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا اس کے پاس باہر کی ڈگری نہیں

ہوتی۔۔۔۔۔ اس نے پیٹ بھر کے کبھی کھایا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ وہ محنت کرنا جانتا ہے وہ ہی
ہوتا ہے جو بھوکے رہنے کی تکلیف سے واقف ہوتا ہے وہ جانتا ہے سڑک پہ سونا مشکل ہوتا ہے
اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مجبور باپ کی آنکھوں میں دم توڑتے خوابوں کیا قیمت ہے۔۔۔۔۔؟
وہ تعلیم سے محروم بچوں کی خواہشات کا احترام کرتا ہے۔۔۔۔۔“
وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا
ماحول یکدم بدل گیا تھا۔۔۔۔۔
دور۔۔۔۔۔ اس چمچماتے کوٹھے میں وہ جہاں آرا کے ہمراہ بیٹھی کسی ٹرانس
میں۔۔۔۔۔ اس کے الفاظوں کے سحر میں مبتلا تھی
وہ کون تھا۔۔۔۔۔ وہ کیا تھا۔۔۔۔۔؟
کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔۔۔
شاید وہ خود بھی نہیں

ابھی یہاں بیٹھے اسے تھوڑا سا احساس ہوا تھا کہ کہیں وہ غلط تھی

وہاں وہ ابھی تک بول رہا تھا

ماحول بدل رہا تھا ریٹنگز بڑھ رہی تھی۔۔۔۔

کوئی ویڈیو پر پہلی بار اپنے ہی متعلق بول رہا تھا۔۔۔۔

”اور آپ لوگ۔۔۔۔۔ یہاں بیٹھے جو انتخابات کے دنوں میں انہی ویڈیو اور جاگیر داروں

کے پیچھے جوتے گھساتے ہیں اور بعد میں آکے مسائل پہ گفتگو کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

اس کے اس طرح کہنے پہ اب رپورٹر شرمندہ دیکھائی دے رہا تھا

مگر وہاں پرواہ کسے تھی۔۔۔۔

”میں جانتا ہوں میری یہ سب باتیں بہت سے لوگوں کو ناگوار گزریں گی۔۔۔۔۔“

میرداد کو دیکھتے ہوئے کہا گیا تھا

وہ تپش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے

اور دور اس کوٹھے میں کوئی ی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی

”لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ اگر سچائی ی آپ کو ناگوار نہیں گزری تو وہ سچائی ی ہے ہی نہیں یا آپ نے اسے دل سے قبول کیا ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔“

میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جب وہ بولتے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں زہر اور چہروں پہ مسکان ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرے نزدیک صاف گوئی ی غلط چیز نہیں ہے کہہ کے کندھے اچکا کے پیچھے ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

اور نیوز رپورٹر لا جواب۔۔۔۔۔

”اب یہاں مزید گفتگو کا کوئی ی فائی دہ نہیں اگر ہے بھی تو میں مزید حصہ لینے کے حق میں نہیں ہوں لہازہ چلتا ہوں۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا کے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

اور وہ یکدم اس کے حصار میں سے نکل آئی ی تھی

نیوز رپورٹر اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے اختتامی جملے بول رہا تھا

میرداد وہاں سے اٹھ کے جا چکے تھے۔۔۔۔۔

اور جہاں آرا وہی بیٹھے کچھ سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔



میں دریا سے بھی گہرا ہوں

تم دریا سے بھی ڈرتے ہو۔۔۔۔۔؟

دوپہر کی تپتی دھوپ اور جولائی کی گرم ہواؤں نے۔۔۔۔۔ اس شہر کے ساتھ ساتھ اس

حویلی نما کوٹھے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا

چھت کے ساتھ لڑکا قدیم زمانے کا پنکھا دھیرے دھیرے چل رہا تھا

اس کمرے میں دونفوس کی موجودگی کے باوجود خاموشی تھی

چمکیلی ساڑھی میں ملبوس بالوں کی لمبی چوٹی بنائے وہ بھرے ہوئے جسم والی عورت تکیے کے
ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھی تھی

اور سامنے ہی سفید کاٹن کے لباس اوپر واسکوٹ پہنے سامنے کے دو بٹن گرمی کی وجہ سے کھول
رکھے تھے

چہرہ سپاٹ تھا۔۔۔۔۔

”مطلب آپ یہ کہہ رہے ہیں آپ ابھی بھی اسی سے ہی نکاح کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”نگار بیگم نے کے لہجے میں اس دفعہ طنز تھا۔۔۔۔۔

”آپ کو پتہ ہے میرا نام کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ تھوڑا آگے ہوا۔۔۔۔۔

”وہاج خان۔۔۔۔۔“

اس نام پہ زور دیا گیا تھا۔۔۔۔۔

”میں جوبات ایک دفعہ ٹھان لیتا ہوں وہ کر کے رہتا ہوں۔۔۔۔۔“ اور اب میری ضد ہے کہ میں اس سے نکاح کروں گا۔۔۔۔۔ کسی بھی قیمت میں اور میں بنوں گا اسے اپنی طوائف اسے بہت غرور ہے نا اسے کوئی استعمال نہیں کر سکتا میں کروں گا اسے استعمال اور پھر اسے کسی ٹشو کی طرح پھینک دوں گا۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے میں غرور اور نفرت تھی۔۔۔۔۔

”تو اس میں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

وہ روکھے لہجے میں بولی۔۔۔۔۔

”آپ نے صرف اس کی ماں کو منانا ہے۔۔۔۔۔“

چاہے جیسے بھی۔۔۔۔۔

اسے میں خود منالوں گا۔۔۔۔۔؟“

اس نے جھٹ سے انہیں کام بتایا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں خان جی وہ نہیں مانے گی۔۔۔۔۔“

نگار بیگم نے جان چھڑانی چاہی تھی۔۔۔۔۔

اس نے جیب سے نوٹ نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔۔۔۔۔

انہوں نے ایک نظر دیکھا اور فوراً جواب دیا

”معذرت۔۔۔۔۔“

دو ٹوک جواب آیا تھا

اس نے نوٹوں میں اضافہ کیا تھا۔۔۔۔۔

انہوں نے پھر ایک نظر دیکھا تھا

اب کی بار سرنفی میں ہلایا

اس نے اور اضافہ کیا تھا۔۔۔۔۔

”ہم سوچیں گے۔۔۔۔۔“

”کہتے ہوئے اٹھالیا تھا۔۔۔۔

وہ دھیرے سے مسکرایا تھا

جیب سے سگریٹ نکالا تھا ایک کش بھری تھی

”ویسے نگار بیگم۔۔۔۔۔ بہت عرصے۔۔۔۔۔ پہلے کی بات ہے کہ اخبار میں ایک خبر نشر

ہونے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ کہ آپ نے ایک یتیم بچی کا ریپ کروایا تھا اور اس کے پیسے لیے

تھے۔۔۔۔۔؟“

وہ سگریٹ کا دھواں ہوا کے سپرد کرتے ہوئے کچھ ایسے اطمینان سے بولا کہ نگار بیگم کو جھنجھوڑ

کے رکھ دیا۔۔۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“

وہ غصے سے چلائی۔۔۔۔

”میرے پاس ثبوت بھی ہے۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا کے بولا۔۔۔۔۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔؟“

وہ ابھی تک صدمے میں تھی

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

انداز چیلنجنگ تھا۔۔۔۔۔

اور زیادہ کچھ کرنا بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ بس کرنا یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس کرنی

ہے۔۔۔۔۔ جس میں 2007 کے کیس کاراز آشکار کر کے داد وصول کرنی ہے۔۔۔۔۔“

مسکرا کے سر کو خم دیا تھا۔۔۔۔۔

وہ بے بسی سے غصے سے آگ بگولا ہو کے بیٹھی ہوئی تھی

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے شخص کی گردن مڑوڑ دیں۔۔۔۔۔

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔۔۔۔۔“

انہوں نے ایک انگلی اٹھا کے ضبط سے کہا

وہ ذور سے ہنسا۔۔۔۔

”اور میں ایسا کیوں نہیں کروں گا۔۔۔۔ مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا۔۔۔۔؟“

اس نے تکیہ درست کر کے دلچسپی سے کہا

”جو آپ کہیں۔۔۔۔؟“ آپ کو زرا پاش چاہیئے نا۔۔۔۔ ”ہم کچھ بھی کریں

گے۔۔۔۔“ وہ آپ کی ہی ہوگی۔۔۔۔

اب ان کا انداز منت بھرہ تھا

”ٹھیک ٹھیک۔۔۔۔“ لیکن یہ تو ہو گیا اس بات کو چھپانے کا معاوضہ اب۔۔۔۔ قانون کونہ

بتانے کا کیا معاوضہ دیں گی۔۔۔۔“

اس نے معصومیت سے کہا

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔۔۔۔

میں سمجھاتا ہوں۔۔۔۔

”زیادہ نہیں پانچ لاکھ دے دیں۔۔۔۔“

بہت آرام سے ڈیمانڈ کی گئی تھی

”ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“

وہ بے چارگی سے بولی۔۔۔۔

”ارے آپ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیں۔۔۔۔“

وہ یکدم اٹھ بیٹھا مسکراتے ہوئے جوش سے بولا

وہ اس کا منہ دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔

پھر وہ نوٹ دوبارہ وہی رکھ دیئے۔۔۔۔

اس سے جیتنا مشکل تھا وہ ہاج خان تھا۔۔۔۔ وہ لوگوں کے دماغوں کے ساتھ کھیلنا جانتا

تھا۔۔۔۔

”نوٹ جیب میں ڈال کے وہ باہر نکل گیا

نگار بیگم کلس کر رہ گئی۔۔۔۔۔



اب تو آنکھوں میں فقط دھول ہے کچھ یادوں کی

ہم اسے یاد بھی آئے تو کب یاد آئے۔۔۔۔۔؟

باہر ٹیبل۔۔۔۔۔ کے اوپر پڑے گلداں۔۔۔۔۔ سے تیزی سے کوئی می ٹکرایا تھا اور وہ زمین

بوس ہو کے کسی کے پاؤں پہ جا کے گرا تھا۔۔۔۔۔

اس کی نظر اس کے سفید پاؤں سے ہوتے ہوئے اس کے چہرے تک گئی تو ایک لمحے کے

لیے اس کے تاثرات بدلے

چہرے پہ سختی در آئی

وہ درد کی شدت سے زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔۔

سفید پاؤں خون سے بھر گیا تھا اور ساتھ ہی زمین کو بھی لال کر گیا تھا
پتہ نہیں کیوں اس کا دل پسچ رہا تھا۔۔۔۔۔
وہ اسے نظر انداز کرتا آگے بڑھ گیا۔۔۔
لیکن وہ دو قدم سے آگے نہیں جا پایا۔۔۔۔۔
پھر پلٹا۔۔۔۔۔

زمین پہ بیٹھا اسی دن کی طرح۔۔۔۔۔ جیب سے رومال نکالا اور اس کے پاؤں پہ باندھنے
لگا۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ نظریں جھکا کے بیٹھی رہی
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔
جانے لگا۔۔۔۔۔

جب اس نے پکارا

وہ رکامگر پلٹا نہیں۔۔۔۔

”ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی تھی

وہ کچھ تذبذب کا شکار لگتی تھی اس لیے رک رک کر بول رہی تھی۔۔۔۔

”ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔۔۔۔ ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔۔۔۔“

اس نے شرمندگی سے سر جھکا کے کہا۔۔۔۔

وہ اس چیز کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔

اس لیے فوراً پلٹا۔۔۔۔

میں اتنی جلدی معاف نہیں کرتا لوگوں کو۔۔۔۔“

سختی سے کہہ کے جانے لگا

جب وہ فوراً سے بول پڑی

”آپ جو بھی کہیں گے ہم کریں گے بس ہمیں معاف کر دیں۔۔۔۔“

لہجے میں التجا تھی

وہ ذو معنی انداز میں ہنسا۔۔۔۔

پھر پلٹا۔۔۔۔۔

”جو ہم کہیں مانیں گی۔۔۔۔۔“

اس کے قریب بالکل اس کے سامنے آ کے کھڑا ہوا

اس کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔۔

”مجھ سے شادی کر لیں۔۔۔۔۔؟“

چہرے پہ ہنوز تپش بھری مسکراہٹ تھی

وہ جسے مسکراہٹ سمجھ رہی تھی

وہ اصل میں آگ تھی جو اسے لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھی۔۔۔۔

وہ کچھ بھی نہ بول پائی ی بس منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

”کہیں مانیں گی۔۔۔۔؟“

دوبارہ پوچھا گیا تھا

”نہیں نا۔۔۔۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا

”پھر معافی بھی نہیں مل سکتی۔۔۔۔۔“

وہ وہاں سے چلا گیا اور وہ اسے روک بھی نہ پائی

پہلی دفعہ دل کو کچھ ہوا تھا

مگر کیوں۔۔۔۔؟“



چاند سے کہہ دو بے دھڑک اترے

گھر میں درود یوار نہیں ہم ہیں۔۔۔۔۔♥

رات کے اس پہر جب پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔۔۔ جب روڈویران اور
سنسان پڑے تھے۔۔۔۔۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں دبکے پڑے آرام فرما رہے تھے
سڑھیوں سے ہوتے ہوئے جاؤ تو اوپر چھت کی گرل پہ لٹکتی بتیاں جل بجھ رہی تھی آسمان آج
نیلا نہیں بلکہ کالا تھا ستارے رخ چھپا کے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ کوٹھے کے ہر کمرے کی بتی آہستہ
آہستہ بجھ گئی تھی۔۔۔۔۔

سوائے اس کمرے کے جس میں رات کے اس پہر بھی بتی جل رہی تھی اس نے جہاں آرا کی
گود میں سر رکھا ہوا تھا اور وہ انگلیاں اس کے بالوں میں پھیر رہی تھی۔۔۔۔۔
اس معصوم چہرے والی لڑکی نے یکدم سراٹھا کے گھڑی کی طرف دیکھا تھا جو صبح کے تین کا
ہندسہ عبور کر چکی تھی۔۔۔۔۔

”اماں جان تہجد کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے اسی طرح ترچھا لیٹے ہوئے گردن گھما کے اس سے پوچھا تو وہ جواب میں مسکرا
دی۔۔۔۔۔

”سنو زری۔۔۔۔۔ ایک سوال پوچھوں۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اسے پکارا۔۔۔۔۔ تو وہ اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے
پھر ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔۔۔۔۔

”اگر تم یہ کبھی ایسا وقت آئے کہ تمہیں اللہ اور انسان۔۔۔۔۔ نعوذ باللہ اللہ اور انسان کا کوئی
مقابلہ نہیں ہے۔۔۔۔۔؟ لیکن میں یونہی ایک سوال پوچھ رہی ہوں۔۔۔۔۔“

تو تمہارا انتخاب کیا ہو گا۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا

تو وہ ان کا چہرہ تکتے لگی۔۔۔۔۔

”اماں جان زندگی میں کیا ایسا وقت بھی آتا ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ حیران ہوئے بنانہ رہ پائی۔۔۔۔

”ہاں بہت دفعہ جب انسان کا دل اس چیز کی طرف لپکتا ہے جو اسے خدا سے دور لے

جائے۔۔۔۔۔“ اور زری پاش انسان تو جلد باز ہے۔۔۔۔۔ یہ تو خود اللہ فرماتے

ہیں۔۔۔۔۔ اب وہ جلد بازی کن معملات میں کرتا ہے۔۔۔۔۔“؟ تمہیں پتہ ہے تمہیں

یقیناً یہ سوچ کے حیرت ہو لیکن انسان سب سے زیادہ جلد بازی خدا کو چھوڑنے میں ہی کرتا

ہے۔۔۔۔“

انہوں نے کچھ اس اطمینان سے کہا کہ وہ چونک گئی اور سر اٹھائے بنانہ رہ سکی

”ہاں۔۔۔۔۔ زری اللہ کبھی انسان سے اپنا تعلق نہیں توڑتا۔۔۔۔۔ وہ خود سے ایسے

صورتحال بناتا ہے جس سے وہ تعلق نہ ٹوٹے وہ تو تب بھی تعلق نہیں توڑتا جب انسان اس کے

احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے۔۔۔۔۔ وہ پھر بھی توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔۔۔۔۔“ یہ تو

انسان ہے جو تعلق توڑنے میں جلد بازی کرتا ہے انسان کو زندگی میں سب چاہیئے ہوتا ہے
سوائے خدا کے۔۔۔۔۔“

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی اور وہ بس انہیں سن رہی
تھی۔۔۔۔۔

یہ باتیں اس کے لیے نئی تھی اور شاید عجیب بھی۔۔

تو زندگی میں اگر آپ کو کسی ایک کو چننا ہو تو آپ خدا کو چننا زری۔۔۔۔۔“

”چاہے ہم رہیں یا نہ رہیں۔۔۔۔۔“

”جب دنیا کو چنیں گی تو خدا دور چلا جائے گا اور یہ آپ کا سب سے بڑا نقصان ہو گا۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”اور ہاں زندگی میں بہت سے ایسے مقام آئیں گے جب آپ لوگوں کے چہروں سے پردے

ہٹتے دیکھو گی جب آپ لوگوں کے دلوں میں زہر کو جانچوں گی۔۔۔۔۔ جب آپ کے دل پہ

اتنے زخم لگ چکے ہونگے کہ تکلیف نہ قابلِ برداشت ہوگی اور جب تمہیں لگے گا۔۔۔۔۔ کہ
اب آپ دوبارہ کبھی نہیں کھڑی ہو پائی گی۔۔۔۔۔ تو زری اس وقت۔۔۔۔۔ دیک کے
مت بیٹھ جانا۔۔۔۔۔ وہ وقت ہوتا ہے اٹھنے کا۔۔۔۔۔ اپنے بل بوتے پہ سہارا مت
ڈھونڈنا۔۔۔۔۔ سہارا برا ہوتا ہے چاہے دیوار کا ہو یا انسان کا۔۔۔۔۔ کوشش کرنا اپنے ذور پہ
کھڑی ہو۔۔۔۔۔ جب دل تکلیف کی شدت سے پھٹ رہا ہو۔۔۔۔۔ تو اس میں ڈوب
جانا۔۔۔۔۔ میں تو کہتی ہوں پھٹ جانے دینا اس دل کو۔۔۔۔۔ اسے تڑپنے دینا۔۔۔۔۔ اتنا
کے تم اندر سے پوری طرح ٹوٹ جاؤ۔۔۔۔۔ پھر بنانا خود کو۔۔۔۔۔ پھر تمہیں کوئی نہیں
توڑ سکے گا۔۔۔۔۔“

وہ دھیرے دھیرے جیسے اس کے کانوں میں کوئی سی سحر پھونک رہی تھی۔۔۔۔۔
”میں تکلیفوں کے فوری مرہم پہ یقین نہیں رکھتی۔۔۔۔۔ کبھی بھی ایسے نہیں ہوا کہ ہمیں
چوٹ لگے اور وہ فوراً بھر جائے اسے بھرنے میں وقت لگتا ہے۔۔۔۔۔ صدیاں لگتی ہیں زمانے

لگتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر بھی نشان باقی رہ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور دل کے زخم تو کبھی بھی نہیں بھرتے
جو لوگ کہتے ہیں ناکہ دل کے زخم بھر جاتے ہیں وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ دل پہ زخم
نہیں لگتے دھبے لگتے ہے۔۔۔۔۔ جیسے سفید چادر پہ کالی سیاہی کے دھبے۔۔۔۔۔ وہ مدہم
ہو سکتے ہیں مٹتے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ہم جتنا بھی کہیں ہمارے زخم بھر گئے ہیں یہ تو محض ایک
فریب ہے۔۔۔۔۔ وہ دھبے مدہم ضرور ہوتے ہیں مٹتے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ اور آہستہ
آہستہ کسی دیمک کی طرح ہمیں اندر ہی اندر ختم کر دیتے ہیں صدیوں کا بوڑھا بنادیتے
ہیں۔۔۔۔۔“

”اماں جان آپ یہ سب ہمیں کیوں سمجھا رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“
”آخر کار وہ بول ہی پڑی وہ کب سے الجھن کا شکار تھی۔۔۔۔۔“
”کیونکہ ضروری نہیں کہ ہمیں کل آپ کو یہ ساری باتیں بتانے کی مہلت ملے آپ کو بالکل
نہیں پتہ دنیا کا۔۔۔۔۔ بہت معصوم ہیں آپ۔۔۔۔۔“

ان کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ فکر مندی بھی عود آئی تھی۔۔۔۔۔

”اماں جان خدا کے لیے ایسی باتیں مت کیا کریں آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔۔۔۔۔“

وہ ناراض ہو کے اٹھ بیٹھی تھی پھر ان کا ہاتھ چوم کے بولی تھی۔۔۔۔۔

”اچھا ہم کہیں نہیں جا رہے۔۔۔۔۔ لیکن آپ ہم سے ایک وعدہ کریں۔۔۔۔۔ آپ ہار نہیں مانیں گی آپ اپنے والد کو ضرور ڈھونڈیں گی۔۔۔۔۔“

اس کا ہاتھ تھام کے اس سے پوچھا تھا

اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔۔۔۔۔

”کریں وعدہ زری۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس دفعہ زرا ذور دے کر بولا تھا۔۔۔۔۔

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کے انہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔

پھر چپ چاپ سر ہلا دیا تھا

انہوں نے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگالیا تھا۔۔۔۔

ان کے پاس وقت بہت کم تھا

اب انہیں وہاں سے ملنا تھا۔۔۔۔



یہ جو ہر قدم پہ ٹھو کریں کھا رہا ہے

یہ شخص کھائے گا اپنے آپ سے مات آخر۔۔۔۔

موسم گرما کی اس تپتی ہوئی دوپہر میں جب آسمان پہ چمکتے ہوئے سورج کا راج تھا سورج کی تیز کرنیں زمین کو حدت بخش رہی تھی چرند پرند گرمی کی شدت سے گھبرائے ہوئے اور پھول کملائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے ایسے میں رنگ برنگی روشینوں سے مزین اس کوٹھے میں بھی سکوت تھا خاموشی تھی۔۔۔۔ سارے کمروں میں اے سی اون تھے اور سب لڑکیاں اپنے کمروں میں دہکی بیٹھی تھی۔۔۔۔

اس چھوٹے سے نفاست سے سچے کمرے میں پنکھا فل اسپڈ پہ چل رہا تھا۔۔۔۔۔ اور بڑے
پلنگ پہ وہ دنیا جہاں سے بے خبر۔۔۔۔۔ لیٹے رسالہ پڑھنے میں مصروف تھی
توجہ ساری رسالے پر تھی

اس بات سے بے خبر کے ساتھ والے کمرے میں اس کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔۔۔۔۔
چمکیلی ساڑھی زیب تن کیے بالوں کو اونچے جوڑے میں قید کیے۔۔۔۔۔ میک اپ ذدہ چہرہ لیے
وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بے زار سی نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔

ساتھ ہی کالے رنگ کی سلک کی قمیض شلوار پہنے۔۔۔۔۔ گلے میں دوپٹہ ڈالے۔۔۔۔۔ وہ عمر
کے اس حصے میں بھی بہت خوبصورت تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی ی نوجوان دوشیزہ معلوم ہوتی تھی
چہرے پہ صدیوں کی تھکن بہت کچھ کھونے کا ملال۔۔۔۔۔ تھا جسے میک اپ کے ذریعے
چھپانے کی کوشش کی گئی تھی سیاہ بال جن پہ چاندی اتر آئی تھی شانوں پہ پھیلا رکھے
تھے۔۔۔۔۔

سامنے بیٹھے اس مغرور لڑکے نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا

پھر جگ سے پانی انڈیل کے لبوں کے ساتھ لگایا تھا

یہ اس کے جائی زہ لینے کا ایک انداز تھا

چہرہ سپاٹ تھا

اسی لمحے جہاں آرا نے نظر اٹھا کے اس نوجوان لڑکے کو دیکھا تھا

جو اس وقت سفید کاٹن کی شلوار قمیض پہنے بالوں کو ترتیب سے سیٹ کیے۔۔۔۔۔ سامنے کے

دو بٹن ہمیشہ کی طرح کھول رکھے تھے۔۔۔۔۔ گھنی مونچھوں کے نیچے لب دبائے ان کا جائی زہ

لینے میں مصروف تھا

چہرہ مغرور تھا

اور وہ اب تذبذب کا شکار معلوم ہوتی تھی

اسے دیکھ کے انہیں کوئی یاد آیا تھا ایسے جیسے انہوں نے اسے کہیں دیکھ رکھا ہو

مگر کون۔۔۔۔؟

”ہم نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ ہم آپ سے زرپاش کے متعلق بات کر

سکیں۔۔۔۔ نگار بیگم نے ہمیں آپ کی خواہش کے متعلق آگاہ کیا ہے۔۔۔۔“

انہوں نے گلا کھنکار کے گفتگو کا آغاز کیا تھا پھر ایک نظر بے زار سی بیٹھی نگار بیگم کو دیکھا تھا

”جی میں خود پچھلے پانچ منٹ سے اسی انتظار میں ہوں کہ آپ مجھ سے زرپاش کے متعلق بات کریں۔۔۔۔“

لہجے میں اطمینان تھا۔۔۔۔

”آپ زرپاش سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔؟“

اب کی بار انہوں نے نظر اٹھا کے اعتماد سے کہا تھا۔۔۔۔

”آپ مجھ سے اظہار چاہتی ہیں یا اپنا شک دور کرنا چاہتی ہیں۔۔۔۔؟“

وہ ٹھیک ہو کے بیٹھا۔۔۔۔ پھر ایک ابرو اٹھا کے دیکھا۔۔۔۔

”جو بھی سمجھیں آپ۔۔۔۔“

انہوں نے اب کی بار۔۔۔۔۔ سر اٹھا کے پورے اعتماد سے کہا تھا۔۔۔۔

”نہیں آپ سمجھا دیجیئے جہاں آراۓ بیگم اپنی مرضی کا مطلب نکالوں تو شاید آپ کی بات کا

مطلب ہی بدل جائے۔۔۔۔۔؟“

سامنے والا بھی بلا کا پر اعتماد تھا۔۔۔۔۔

”آپ زری سے ہی کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مشکوک لہجے میں پوچھا۔۔۔۔۔

”آپ یہاں پہ کام کیوں کرتی ہیں۔۔۔۔۔؟“

اطمینان سے مگر الٹا سوال پوچھا گیا تھا

وہ یکدم گڑبڑا گئی۔۔۔۔

پھر چونکی۔۔۔۔۔

”کیا مطلب۔۔۔۔؟“

وہ نا سمجھی سے بولی۔۔۔۔۔

”مطلب یہ کہ یہ کام آپ اس لیے کرتی ہیں کیونکہ یہ آپ کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔“

اس نے اب کی بار بھی اعتماد سے کہا۔۔۔۔۔

انہوں نے محض سر ہلادیا

آنکھوں میں ابھی بھی نا سمجھی تھی۔۔۔۔۔

”میں اسی لیے زرباش سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

مختصر کہہ کے وہ خاموش ہو گیا

وہ ابھی ہوئی ی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

”آپ کو زری سے محبت نہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا

”نا۔۔۔۔۔“

اس نے سردائی میں بائیں ہلایا۔۔۔۔۔

”مرد کو کبھی بھی عورت سے محبت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اگر کبھی آپ کو کوئی یہ کہہ دے کہ

مجھے فلاں عورت سے محبت ہے تو۔۔۔۔۔ سمجھ جائیگا وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا

ہے۔۔۔۔۔ محبت کا فلسفہ دماغ سے بالاتر ہے۔۔۔۔۔ جب تک دماغ رہتا ہے محبت نہیں

ہوتی۔۔۔۔۔ عشق کی پہلی۔۔۔۔۔ سیر بھی محبت ہی تو ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور عشق کا مطلب

ہوتا ہے فنا ہو جانا۔۔۔۔۔ یہ جو ہم محبت کی آڑ میں چاہت کے طلبگار ہوتے ہیں پھر محبت کا رونا

روتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم فراڈ دیتے ہیں خود کو۔۔۔۔۔“

وہ بغور ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا۔۔۔۔۔

”میں مرد ہوں تو کیا ضروری ہے مرد کے ہی حق میں بولوں گا اور آپ عورت ہیں تو عورت

کے حق میں بولیں گی میں تو کہتا ہوں ہمیں ایک دوسرے کے حق میں بولنا چاہئے۔۔۔۔۔ مجھے

[illegible]

”میں کہوں عورت با وفا ہے۔۔۔۔ آپ کہیں مرد با وفا ہے۔۔۔۔“

وفا اور محبت کا تعلق مرد یا عورت کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس کا تعلق۔۔۔۔۔ انسان سے ہے۔۔۔۔۔

میں دعویٰ نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اس بات پہ یقین رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ کہ مرد محبت کرے اور ایسی
کرے کے پوری دنیا کو کچھاڑ کے رکھ دے پر رکیں۔۔۔۔۔“

تھوڑا آگے ہوا۔۔۔۔۔

جہاں آرا کو جیسے وہ پینوٹائی زکر رہا تھا۔۔۔۔۔

بات ختم کر کے وہ خود ہی مسکرا دیا جیسے اپنا ہی مذاق اڑا رہا ہو۔۔۔۔۔

اور جہاں آرا کو اس سے خوف محسوس ہوا تھا

وہ انسان سچ بولنا جانتا تھا یا سچ تھوکتا۔۔۔۔۔ وہ سمجھ نہ پائی۔۔۔۔۔

اب یہ آپ کی مرضی ہے۔۔۔۔۔ کہ آپ اس سے میری شادی کروائے یا نہیں۔۔۔۔۔“

آپ کے پاس کتنا وقت ہو گا۔۔۔۔۔“ ایک سال دو سال پانچ سال پندرہ سال چلو

وہ ٹھیک ہو کے بیٹھا

پھر انگلیوں پہ گننے لگا۔۔۔۔۔

وہ منہ کھولے اس کی اس حرکت کو ملاحظہ فرما رہی تھی۔۔۔۔۔

”اگر اس عرصے میں آپ کو کوئی ایسا انسان مل گیا۔۔۔۔۔ جو آپ کی بیٹی کو عزت سے اس

کوٹھے سے شادی کر کے لے جائے۔۔۔۔۔ تو آپ مجھے بتائیے گا میں اس کے پاؤں دھو

کے پینے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔“

مانا۔۔۔۔۔ آپ کی بیٹی نے آج تک رقص نہیں کیا۔۔۔۔۔ ”؟ لیکن۔۔۔۔۔ یہ کوئی
نہیں مانتا وہ کوٹھے پہ رہتی ہے اور کوٹھے پہ طوائف ہی رہتی ہے۔۔۔۔۔“
اس نے اس بار ایک گھٹنے کو زمین پہ ٹکایا دوسرے کو فولڈ کر کے اس کے گھیر بازو کا گھیرہ تنگ
کیا اور چہرے پہ معصومیت سجا کے بولا
تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔۔۔۔۔
وہ اس سے زیادہ اپنی بیٹی کی تذلیل نہیں برداشت کر سکتی تھی۔۔۔۔۔
”بس کریں وہاں بہت ہوا۔۔۔۔۔“ آپ مردوں کی انگلیاں ہم طوائفوں کے جسموں سے
ہوتی ہوئی اب ہماری روحوں تک بھی پہنچ چکی ہیں۔۔۔۔۔“
وہ غصے سے ہانپنے لگی
”نگار بیگم لطف اندوز ہو رہی تھی۔۔۔۔۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں ہماری بیٹی کو کوئی اچھا انسان نہیں مل سکتا۔۔۔۔۔“؟ ہماری بیٹی نیک

خون ہے جو کوٹھے میں بھی رہ کے برائی یوں سے دور رہی۔۔۔۔۔“

”اور آپ لگائی یں گی ان کی قیمت۔۔۔۔۔؟“

جو خود ایک طوائف کے کوٹھے پہ بیٹھ کے اس کی تذلیل کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“؟

”ہم بھی آپ کو زبان دیتے ہیں ایک ہفتے کے اندر اندر ہم زریپاش کی شادی آپ سے بھی اچھے

عزت دار لڑکے سے کروا کے دیکھائے گے۔۔۔۔۔“

وہ آنکھوں میں انگارے لیے۔۔۔۔۔ اسے انگلی اٹھا کے چیلنج کر رہی تھی

اور وہ انگلی تھوڑی کے نیچے ٹکائے متاثر کن نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ کہہ کے رکی نہیں تھی۔۔۔۔۔

وہاں سے نکل گئی تھی۔۔۔۔۔

اب وہاں صرف نگار بیگم اور وہاں تھے۔۔۔۔۔

”پتہ نہیں سچ بول تو ان لوگوں کو تذلیل کیوں لگتی ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ چڑ گیا تھا

ایک نظر نگار بیگم کو دیکھا تو وہ گڑ بڑا گئی۔۔۔۔۔

وعدہ یاد ہے نا آپ کو اپنا۔۔۔۔۔؟“

اس نے مسکرا کے سر ہلادیا۔۔۔۔۔

انہوں نے تیزی سے سر ہلادیا۔۔۔۔۔

وہ اٹھا چابیاں اٹھائی اور باہر نکل گیا

پیچھے نگار بیگم سر جھٹک کے رہ گئی۔۔۔۔۔

جہاں آرا نے اندر داخل ہو کے تیزی سے دروازہ بند کیا تو وہ گڑ بڑا کے اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔

تیزی سے جہاں آرا کی طرف بڑھی۔۔۔۔۔ جو لمبے لمبے سانس لے رہی تھی

”اماں جان آپ ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ گھبرا گئی ان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا
”زری آپ وہاں کو اپنی زندگی میں ہرگز قبول نہیں کریں گی۔۔۔۔۔“
انہوں نے زری کے دونوں ہاتھوں کو تھام کے۔۔۔۔۔ تیز لہجے میں کہا
اس کا دل چاہا وہ سوال کرے کیوں۔۔۔۔۔؟“
لیکن ان کی حالت کے پیش نظر۔۔۔۔۔ اس نے خاموشی سے انہیں گلے لگا لیا
جہاں آرا اب ہچکیوں سے رو رہی تھی
ساتھ ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی
باہر گرمی کی شدت میں اب قدرے کمی واقع ہو گئی تھی
مگر سینوں میں آگ ہنوز جل رہی تھی۔۔۔۔۔



عزیز تر تھی جسے نیند شام وصال میں

وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسے۔۔۔۔۔؟

روشن دان میں بھڑکتی ہوئی آگ اور باہر تیز آندھی۔۔۔۔۔ برستی بارش۔۔۔۔۔
اونچی بلڈنگ کے سب سے اوپر والے فلور کی کھڑکی میں وہ شخص برستی بارش کو کھوئی
کھوئی نظر سے دیکھ رہا تھا

انگلیوں کے درمیان دبا سگریٹ آہستہ آہستہ بجھ رہا تھا۔۔۔

اٹلی کی اس خون جمادینے والی سردی میں وہ۔۔۔۔۔ اونچے لمبے قد۔۔۔۔۔ والا

مرد۔۔۔۔۔ جو بظاہر مضبوط اعصاب کا مالک معلوم ہوتا تھا نائیٹ بلب کی مدہم روشنی میں
اس کے نقوش واضح تھے۔۔۔۔۔ گول چہرہ سانولی رنگت۔۔۔۔۔ کلین شیو

چہرہ۔۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بال۔۔۔۔۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی
تھی

کالے رنگ کی ٹراؤزر شرٹ اور اپر پہنے وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے یوں ہی کھڑا تھا

بلڈنگ کی ساری لائی ٹیس اب آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھی۔۔۔۔۔

آخر وہ پلٹا ایک نظر دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھا۔۔۔۔۔ جورات گیارہ کا ہندسہ عبور کر گئی تھی

آخر اس نے پردہ برابر کیا۔۔۔۔۔

جلے ہوئے سگریٹ کو وہی پھینکا۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔ لائی ٹ آف کی سٹڈی ٹیبل کی لائی ٹ آن کی۔۔۔۔۔ اور وہی بیٹھ گیا

کالے کور والی ڈائری کھولی آخری صفحے پہ درج تاریخ دیکھی۔۔۔۔۔

اس کے چہرے پہ سایہ سالہرایا

”جاناں۔۔۔۔۔“

”تم سے بچھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ آج دس دن بارہ گھنٹے بیس منٹ اور پانچ سیکنڈ گزر گئے

ہیں۔۔۔۔۔ میں سوچتا ہوں میری ریاضی کب سے اتنی اچھی ہو گئی تمہارے فراق نے مجھے

کیا کچھ نہیں سکھا دیا۔۔۔۔۔ تمہارا میرا تعلق کیسا عجیب ہے میں اسے محبت کا نام نہیں دیتا میں

اسے چاہت بھی نہیں کہوں گا اور ہاں سنو میں۔۔۔۔۔ مجبوری اور ضرورت کا نام دیتے ہوئے
بھی کتراؤں گا۔۔۔۔۔ ”مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی ی۔۔۔۔۔ تمہارے بغیر اتنا بے چین
ہوں تو یہاں کیوں بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔ اور ہاں یہ بتانا تو میں تمہیں بھول ہی گیا۔۔۔۔۔“ آج
اپنے ایک دوست کو تمہاری تصویر دکھائی ی۔۔۔۔۔ کہا دیکھو یہ کتنی خوبصورت ہے کیا اس
جیسی خوبصورت عورت تم نے پہلے کبھی دیکھی ہے۔۔۔۔۔ ”؟ وہ مجھ پہ بہت ہنسا کہتا ہے تم
پاگل ہو گئے ہو یہ اتنی بد شکل عورت تمہیں حسین لگتی ہے۔۔۔۔۔ اس کے ایسے بولنے پہ
میں برداشت نہیں کر پایا میں نے اس کا منہ نوچ لیا وہ ہوتا کون ہے تمہیں بد صورت کہنے
والا۔۔۔۔۔؟ میرے دل سے پوچھو تم کتنی خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ یعنی جاناں میں آج
تمہارے لیے ایک اور تعلق ختم کر آیا میں تمہارے لیے اور کتنے تعلق ختم کروں
گا۔۔۔۔۔؟“ میں یہ سوچتا ہوں۔۔۔۔۔ تم اگر خوبصورت ہو تو دنیا کو خوبصورت کیوں نہیں
لگتی اور اگر بد صورت ہو تو مجھے اتنی خوبصورت کیوں لگتی ہو۔۔۔۔۔؟“ مجھے تو تم پہلے

دن سے ہی خوبصورت لگی تھی۔۔۔۔۔ لوگ تمہیں عام کہتے ہیں میں تمہیں خاص کہتا
ہوں۔۔۔۔۔ اگر مجھے دنیا کبھی یہ آپشن دے کے سب چھوڑ کے ایک چیز چن لو تو میرا انتخاب
تم ہوگی ارے انسان۔۔۔۔۔ بھی کتنا خوش فہم ہے جو سوچتے ہے بھلا وہ بھی کبھی حاصل کر پاتا
ہے پر سنو جاناں یہ بھی حقیقت ہے ہمیں ایک دوسرے کے بغیر رہنا ہے۔۔۔۔۔ پر امید بھی
ہے شاید زندگی میں کسی جگہ تم مجھے بھولی بسری مل جاؤ۔۔۔۔۔

ٹیبیل لیمپ بجھا دیا گیا تھا

اب پورے کمرے میں تاریکی تھی۔۔۔۔۔



اس کی قربت میں ہے کیا بات نا جانے

ایک لمحے کے لیے صدیوں کو بھلا دیتا ہے۔۔۔۔۔

رات کی اس تاریکی میں کوئی دے قدموں اس بڑے کمرے میں داخل ہوا تھا

پلنگ پہ نگار بیگم خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی
کھڑکی کے باہر جلتے بلب کی روشنی چھن سے اندر داخل ہو رہی تھی
اس نے نظروں کو ادھر ادھر گھمایا آخر اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔۔۔۔۔
اس نے تیزی سے موبائی ل جھپٹا۔۔۔۔۔
ایک لمحے کے لیے روشنی کی شعاعیں چھت کے ساتھ لٹکتے پنکھے پہ عکس چھوڑ گئی۔۔۔۔۔
اس نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا نگار بیگم ابھی تک سو رہی تھی
اس نے سکھ کا سانس لیا
اس کے ہاتھ اب تیزی سے چل رہے تھے
اس نے اپنا مطلوبہ کام ختم کیا موبائی ل اپنی جگہ پہ رکھا
پھر دبے قدموں۔۔۔۔۔ چھت پہ چلی گئی۔۔۔۔۔
اب بھی اس کے ہاتھوں میں تیزی تھی۔۔۔۔۔

دور۔۔۔۔۔ اس حویلی میں رات کے اس پہر مکمل تاریکی تھی سوائے اس کے کمرے

کے۔۔۔۔۔ اس نے زمین پہ بچھائی می جائے نماز کو تہہ کیا۔۔۔۔۔

سر سے ٹوپی اتار کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی۔۔۔۔۔

اور بجتے ہوئے موبائی ل کی طرف بڑھا

غیر شناسا نمبر دیکھ کے ایک لمحے کے لیے چونکا۔۔۔۔۔

پھر فون اٹھالیا

”آواز سن کے اسے محسوس ہوا جیسے جانی پہچانی ہے۔۔۔۔۔“

”ہیلو ہم زرپاش بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

آواز میں اعتماد تھا وہ مسکرائے بنانہ رہ پایا۔۔۔۔۔

”ذہے نصیب محترمہ۔۔۔۔۔“

”آج آپ نے خود ہم سے رابطہ کیا۔۔۔۔۔؟“

ذو معنی لہجے میں کہا گیا تھا

”جی کیوں کے بات ضروری تھی۔۔۔۔۔“

اس نے سہمی ہوئی نظریں سڑھیوں سے نیچے تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے کمروں پر

ڈالی۔۔۔۔۔

”محبت کا اقرار اگر صبح کی روشنی میں کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔۔۔۔۔“

اس نے کھڑکی سے باہر پورے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

وہ گڑبڑا گئی

”یہ آپ کو کس نے کہا۔۔۔۔۔؟“

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”ضروری ہے ہر بات کہی جائے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ باتیں سمجھی بھی جاتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ پتہ نہیں کیا کہنا چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“؟ ہم تو یہ پوچھنا چاہ رہے تھے کیا ہماری اماں جان کی اور

آپ کی ملاقات ہو چکی ہے۔۔۔۔۔“؟

آواز ہنوز آہستہ تھی۔۔۔۔۔

”وہ دھیرے سے مسکرایا۔۔۔۔۔

”جی۔۔۔ کیوں وہ آپ کو گھبرائی ہوئی محسوس ہوئی۔۔۔۔۔“؟

عام سے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔۔۔۔۔

”جی تب ہی پوچھ رہے۔۔۔ ہیں۔۔۔ کہ آپ ہمیں بتادیں۔۔۔۔۔“

اس نے جان چھڑانی چاہی۔۔۔۔۔

چہرے پہ گھبراہٹ واضح تھی۔۔۔۔۔

”چلیں۔۔۔ مطلب آپ ہمیں اپنا سمجھتی ہیں۔۔۔۔۔“؟

وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔۔۔

”ہمارے سوال کا یہ جواب نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

اس کے لہجے میں سختی عود آئی تھی

اور میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں ہوں۔۔۔۔۔“

دوبدو جواب دے کے اسے لا جواب کر دیا گیا تھا۔۔۔۔۔

”اگر آپ کہیں گے تو میں آپ کو دوبارہ کبھی کال نہیں کروں گی

وہ روہانسی ہوئی۔۔۔

”اور اگر میں کہوں کرو تو کرو گی۔۔۔۔۔؟“

اس نے ایک ابرو اچکا کے مزے لیتے ہوئے کہا

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے تیزی سے کال کاٹ دی

دل کی دھڑکن بے ترتیب تھی

اور وہ موبائی ل سکرین کو گھور کے بیٹھ گیا
”پاگل عورت وہ ہے جو محبت کر بھی بیٹھے تو تسلیم نہیں کرتی
وہ ذور سے ہنسا۔۔۔۔۔“

چاند نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھا تھا



ہوئے برباد لیکن سدھر نہ پائے ہم

وہی عقیدہ وہی تم

اور صرف تم۔۔۔۔۔“

وقفے وقفے سے ہونے والی برف باری۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں نے ماحول کی
پرسرایت میں اضافہ کر رکھا تھا لمبے قد آور درختوں پہ جمی برف چمک رہی

تھی۔۔۔۔۔ آسمان پہ بادل دھیرے دھیرے تیر رہے تھے۔۔۔۔۔ گہرے آسمان پہ کالی
لکیریں تھی۔۔۔۔۔ بادل برسنے کو بے تاب تھے۔۔۔۔۔

شام کے اس پہر۔۔۔۔۔ جب پارک میں اکا دکا لوگ دیکھائی دے رہے
تھے۔۔۔۔۔ پارک کے کسی ایک کونے میں لانگ کوٹ اور اپر پہنے لوگ ہاتھوں کو آپس میں
رگڑتے دیکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔

وہ بھی پارک کے کونے میں پڑے ایک بیچ پہ۔۔۔۔۔ تنہا بیٹھا آسمان کو گھور رہا
تھا۔۔۔۔۔ کالے رنگ کے لانگ کوٹ۔۔۔۔۔ نیچے جاگرز پہنے وہ دنیا جہاں سے بے گانہ
معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔۔ آنکھوں میں ویرانی تھی سر پہ اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔۔۔۔۔ سردی
کی وجہ سے ناک لال تھی۔۔۔۔۔ رنگت سرخ معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔
اس نے ایک نگاہ اطراف پہ دوڑائی۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ لوگ۔۔۔۔۔ اب رخصت ہو
رہے تھے۔۔۔۔۔

اسے محسوس ہوا تھوڑی دیر بعد وہ یہاں اکیلا رہ جائے گا۔۔۔۔

اس نے پاس پڑی وہی بلیک کور والی ڈائی ری اٹھائی

اور یو نہی صفحے پلٹنے لگا۔۔۔۔۔

آخر اس کی نظریں ایک نظم پہ آ کے ٹھہر گئی

اس کی آنکھوں میں کرب ابھرا۔۔۔۔۔

”سردیوں کی اس سرد شام میں۔۔۔۔۔“

جب بارش کے قطرے۔۔۔۔۔ کوئی دھن سنائی یں۔۔۔۔۔“

جب پرندوں کے گیتوں میں تم کھو جاؤ۔۔۔۔۔

کوئی ایسا بھی تو وقت آئے جاناں۔۔۔۔۔

جب تم میرے ہو جاؤ۔۔۔۔۔

”جب مسکراہٹیں میرا مقدر ہو جائی یں۔۔۔۔۔“

جب صداقتوں سے بھرے یہ جذبے۔۔۔۔۔ میری بھی روح میں سرائی ت کر
جائیں۔۔۔۔۔

جب میری مسکراہٹوں میں تمہارا عکس ہو۔۔۔۔۔
تمہاری باتوں میں میرا ذکر ہو۔۔۔۔۔“

تمہاری آنکھوں میں فقط میرے نام سے قندیلیں جل اٹھیں۔۔۔۔۔
کوئی ایسا بھی وقت ہو جانا۔۔۔۔۔

جب تم میرے ہو جاؤ۔۔۔۔۔

وہ کتنی ہی دیر اس تحریر پہ ہاتھ پھیرتا رہا جیسے لکھنے والے کو محسوس کر رہا ہو۔۔۔۔۔

جاناں۔۔۔۔۔

تمہیں یاد ہے۔۔۔۔۔ ”جب تم نے میری اس ڈائیری پہ میری غیر موجودگی میں یہ نظم لکھی تھی۔۔۔۔۔ میں تم پہ کتنا چنچا تھا۔۔۔۔۔ کہ تم نے میری ڈائیری کو کیوں

چھو۔۔۔۔۔ تمہارے ہاتھوں سے مجھے کتنی کرخت آتی تھی۔۔۔۔۔ تم نے میرے سامنے
 سر نہیں اٹھایا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت میں چاہتا تھا تم میرے سامنے کبھی نہ آؤ آج میں چاہتا
 ہوں میں جس طرف دیکھوں تم ہی نظر آؤ اس وقت تم ہر جگہ تھی لیکن مجھے کہیں بھی
 دیکھائی دیتی تھی آج تم کہیں نہیں ہو لیکن ہر جگہ دیکھائی دیتی ہو۔۔۔۔۔ جانتی ہو
 کبھی کبھی سوچتا ہوں۔۔۔۔۔ انسان بہت عجیب تخلیق ہے۔۔۔۔۔ ”جب چیزیں اس کی دسترس
 میں ہوتی ہیں تو ان سے کتراتا ہے اور جب چیزیں اس کی دسترس سے نکل جاتی ہیں تو ان کے
 لیے تڑپتا ہے۔۔۔۔۔ خیر جانے دو انسان خسارے ہی تو بٹورنے آیا ہے دنیا میں۔۔۔۔۔ اور
 میں نومہ سے ایک ان دیکھی تکلیف کے زیر اثر ہوں۔۔۔۔۔ لیکن یقیناً مانو پہلے تم سے آزادی
 چاہتا تھا۔۔۔۔۔ آج تم سے خلاصی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ تمہاری آواز سے تمہاری بے بسی
 سے۔۔۔۔۔ تمہاری یادوں سے تمہارے۔۔۔۔۔ لمس سے اور سب سے بڑھ کر تمہاری محبت
 سے۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب احساس مجھے اپنی گرفت میں لے چکے ہیں صبح کے وقت مجھے عجیب

بے چینی میں اور رات کے وقت عجیب بے سکونی میں مبتلا رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ کیا انسان کو جیتے جی آزادی ملتی ہے مجھے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔ اب تم کبھی مجھے آزاد نہیں کرو گی تمہارا احساس قبر تک میرا پیچھا کرے گا۔۔۔۔۔۔ لیکن میں کیا کروں میں تو انسان ہوں اور انسان بہت بے بس ہے۔۔۔۔۔۔“

آخری لائی میں لکھتے ہوئے اسے اپنی آنکھیں نم محسوس ہوئی تھی۔۔۔۔۔

اور آسمان سے ایک دفعہ پھر سفید گولے برسنے لگے تھے

اور وہ تن تنہا وہاں سر جھکائے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔



کتنے مومن نما لٹیرے ہیں
لوٹتے ہیں خدا خدا کر کے۔۔۔

جون کی اس تپتی دوپہر میں جب سورج آگ برسا رہا تھا یہ بڑی حویلی سورج کی کرنوں کے زیر
اثر تپ رہی تھی کھانے کی غرض سے گھروں کو لوٹے پسینہ پونچھتے محنت کش
کسان۔۔۔۔۔ گھبرائے ہوئے سورج کو دیکھ کے آگے بڑھ رہے تھے۔۔۔۔۔ کچے مکانوں
میں موجود عورتیں۔۔۔۔۔ کچے برآمدوں میں پانی کا چھڑکاؤ کر رہی تھی۔۔۔۔۔ جھلسے ہوئے
جانور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کے پناہ مانگ رہے تھے وہ سفید رنگ کی صاف
ستھری قمیض شلوار پہنے۔۔۔۔۔ سڑھیاں اتر رہے تھے۔۔۔۔۔ عجلت میں ڈرائی یور کو آوازیں
دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”صاحب جی۔۔۔۔۔ سفر دوسری گاڑی میں۔۔۔۔۔ رجب صاحب جی کو شہر لے کے
گئے ہیں۔۔۔۔۔ اور گاڑی تو ہے لیکن ڈرائی یور نہیں ہے۔۔۔۔۔“
ملازم نے سر جھکا کے انہیں اطلاع دی تھی۔۔۔۔۔
تو انہوں نے غیض و غضب سے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

”کیا مطلب جب ہم نے کہا تھا کہ ہم نے ضروری کام سے جانا ہے تو وہ کیوں۔۔۔۔۔ رجب
بھائی کو لے گئے۔۔۔۔۔“

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس نا انصافی پہ دنیا کو تہس نہس کر دیں۔۔۔۔۔ رجب خان کی
عادت تھی کہ وہ شہباز خان کو نیچا دیکھانے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔۔۔۔۔
خان جی۔۔۔۔۔ آپ گاڑی خود چلا کے لے جائیں یا پھر گاڑی بک کروالیں۔۔۔۔۔“
ملازم نے رائے کا اظہار کیا۔۔۔۔۔

انہوں نے پلٹ کے تپش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔۔۔
”دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ ہم شہباز خان ہیں ہم۔۔۔۔۔ لو کل گاڑیوں کے دھکے
کھائی یں گے۔۔۔۔۔“

انہوں نے غصے سے چیخ کے کہا۔۔۔۔۔

سڑھیاں چڑھتے۔۔۔۔۔ وہاں نے پلٹ کے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ ان کی آخری

بات اس کی سماعتیں سے ٹکرائی تھی

ان کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔۔۔۔۔

وہ کندھے اچکا کے آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔

ایسے میں بڑی حویلی کے اس بڑے کمرے میں موجود وہ سفید بالوں والا شخص بھی تاسف سے

صوفے پہ بیٹھے اس کا انتظار کر رہا تھا

جب وہ داخلی دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا

اور گردن اکڑا کے کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔

”دو دن کہاں تھے آپ۔۔۔۔۔؟“

ان کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ تھا اس کے باوجود وہ غصے میں لگتے تھے۔۔۔۔۔

سامنے موجود شخص ہنوز مطمئن بن تھا۔۔۔۔۔

”جہاں ہوتا ہوں اکثر۔۔۔۔۔“

لاپرواہی سے کہتے ہوئے اس نے پنکھے کی اسپیڈ بڑھائی تھی۔۔۔۔۔ پھر ایک لمبا سانس لیا
تھا۔۔۔۔۔ سامنے کے دو بٹن ہمیشہ کی طرح کھول رکھے تھے۔۔۔

وہ بس تاسف سے اس کو دیکھ کے رہ گئے۔۔۔۔۔

”وہاں کیا آپ ہمیں بتانا پسند کریں گے کہ آپ کب تک سدھریں گے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے طنز سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”کیا میں ابھی بگڑا ہوا ہوں۔۔۔۔۔؟“

اس نے حیرت سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”کیا اس میں کوئی شک ہے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے ایک ابرو اٹھا کے کہا تھا۔۔۔۔۔ لہجے میں ہنوز طنز تھا۔۔۔۔۔

”اپنی نظر میں برا ضرور ہوں گناہ گار بھی ہوں بگڑا ہوا نہیں ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔۔۔۔

”اور دنیا کا کیا وہاں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے اسے باور کروایا تھا۔۔۔۔۔

”کیا دنیا آپ کو اچھا سمجھتی ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ آگے بڑھے تھے ان کا لہجہ تیز ہوا تھا

وہ سامنے صوفے پہ جا بیٹھا تھا۔۔۔۔۔

اطمینان سے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔

”دنیا آپ کو ٹھیک کہتی ہے کیا۔۔۔۔۔؟“

اس نے اکتا کے دو بدو جواب دیا تھا۔۔۔۔۔

”دادا جی یہ دنیا ہے یہ کسی کو بھی ٹھیک نہیں کہتی یہاں آپ جتنے بھی ایمان دار ہیں جتنے بھی سچے ہیں عزت پھر بھی نہیں کرے گا کوئی ی۔۔۔۔۔ ہاں اگر آپ کے پاس نوٹ ہیں تو لوگ بچھ بچھ جائیں گے آپ کے قدموں میں۔۔۔۔۔“

”میں ایسی دنیا کو منہ لگانا فقط اپنی تذلیل سمجھتا ہوں ان کو خوش رکھنا۔۔۔۔۔ محض ایک خود فریبی ہے۔۔۔۔۔ وہ کبھی خوش نہیں ہوگی آپ جتنے بھی اچھے ہیں دنیا کی نظر میں آپ برے ہیں۔۔۔۔۔“

اس کا چہرہ سپاٹ لہجہ۔۔۔۔۔ تیز تھا۔۔۔۔۔

”فضول باتیں مت بنائیں وہاں۔۔۔۔۔ آپ کو ہم نے ہی سرچڑھایا ہے آپ کے باپ تک اگر آپ کی باتیں پہنچیں گی تو کیا عزت رہ جائے گی ان کی نظر میں آپ کی۔۔۔۔۔؟“

وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اونچی آواز میں بولے تھے۔۔۔۔۔

وہ سرتاپا انہیں گھور کر رہ گیا۔۔۔۔۔

”کیا حرکتیں ہیں میری۔۔۔۔۔؟“

اس نے وہی بیٹھے بیٹھے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔۔۔

”میں تو براہوں غلط ہوں گناہ گار ہوں میں کہتا ہوں مجھے پردے ڈالنا منہ چھپانا نہیں

آتا۔۔۔۔۔ میں تو کچھ غلط کروں تو خدا کے سامنے دودن نہیں جاتا۔۔۔۔۔ میں اس سے منہ

چھپاتا پھرتا ہوں۔۔۔۔۔ میں گناہوں کو جسٹیفائی نہیں کرتا۔۔۔۔۔ یہ حرکتیں ہیں

میری۔۔۔۔۔“

وہ ابھی تک ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔

اور آپ کہتے ہیں آپ انہیں بتائیں گے وہ سب جانتے ہیں دادا جی وہ مجھے آئیڈولائیڈ ڈشو

کرتے ہیں صرف۔۔۔۔۔ اپنے چھوٹے بھائی کو یہ باور کروانے کے لیے کے میں ایک بیٹے کا

باپ ہوں۔۔۔۔۔“

وہ اب کی بار اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر رہا تھا

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی۔۔۔۔۔ گناہ گار تو ہم سب ہیں۔۔۔۔۔ لیکن تسلیم ہم سب نہیں کرتے جو گناہ ہم دوسرے میں تلاش کرتے ہیں وہی گناہ ہمارے اندر بھی ہوتے ہیں لیکن ہم خود کو پاکیزہ ظاہر کرنے میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کی برائی یاں تلاش کرنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔“

ہم انسان تو۔۔۔۔۔ خدا کے کاموں میں مداخلت کرتے بھی دریغ نہیں کرتے۔۔۔۔۔ ہم انسان اتنے جھمینٹل کب سے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔

اس کے لہجے میں افسوس تھا

وہ لا جواب تھے۔۔۔۔۔

ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ اٹھا تھا ان کے قریب سے گزر کے باہر نکل گیا تھا۔۔۔۔۔

وہ انسان کیا تھا کوئی کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔۔۔۔۔



اس مصروف سڑک پہ گاڑیوں کا بہت رش تھا۔۔۔۔۔ جگہ جگہ بھیگ مانگنے والے دیکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔ لوگ گرمی کی وجہ سے گھبرائے یہاں وہاں جاتے دیکھائی دے رہے تھے جیسے سب کو گھر پہنچنے کی جلدی ہو۔۔۔۔۔ گاڑیوں کے ہارن اور عجیب شور میں گھری اس کی کرولا بھی کھڑی تھی جس کے کالے شیشے بند تھے۔۔۔۔۔ اندر اے سی آن تھا۔۔۔۔۔

اس نے اکتائی ہوئی نظریں ونڈا سکرین پہ جمار کھی تھی
جہاں اگلی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس آن تھی۔۔۔۔۔
ٹریفک پچھلے دس منٹ سے جام تھی۔۔۔۔۔

اسی لمحے شہر کی اس مصروف مارکیٹ میں جہاں آرا ۶ ملازم کے ہمراہ اس بڑے سے پلازے کے اندر بنی جوتوں کی دکان۔۔۔۔۔ میں کھڑی خریداری میں مصروف تھی۔۔۔۔۔

کالے رنگ کا عبا یہ جو پاؤں کو چھو رہا تھا۔۔۔۔۔ پردے سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا صرف

آنکھیں جھلک رہی تھی۔۔۔۔۔

آنکھوں میں تھکن تھی۔۔۔۔۔

اسی لمحے گاڑی کے سکوت کو۔۔۔۔۔ اس کے بجتے موبائی ل نے توڑا۔۔۔

اس نے جھک کے نمبر دیکھا

چونکا پھر موبائی ل کان کے ساتھ لگا لیا۔۔۔۔۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ چاچا جان۔۔۔۔۔“؟

عام سے لہجے میں کہا گیا تھا۔۔۔۔۔

مصروف سڑک کے ایک طرف خراب گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑے اس سفید داڑھی

والے شخص نے۔۔۔۔۔ جیب سے رومال نکال کے ماتھا صاف کیا تھا۔۔۔۔۔

”وہاں کہاں ہیں آپ۔۔۔۔۔“؟

لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔۔۔۔۔

”میں نے ابھی صدر کو اس کیا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے اطراف کا جائی زہ لیتے ہوئے سر سری بتایا۔۔۔۔۔

کیا آپ صدر واپس آسکتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم نے ای رپورٹ پہنچنا ہے۔۔۔ ہماری فلاحی ٹیم

ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اور ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے گاڑی کو ایک نظر دیکھ کے پریشانی سے کہا۔۔۔

اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا

پہلی دفعہ مدد مانگی گئی تھی۔۔۔

اس نے کندھے اچکا دیئے۔۔۔۔۔

”وہی کھڑے ہو میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔“

کہہ کے اس نے یوٹرن لی۔۔۔۔۔

گاڑیاں سڑک پہ ابھی بھی رک رک کے چل رہی تھی۔۔۔۔



ہم ہیں ہمراہ رات کے محسن

جن کی قسمت میں سحر نہیں۔۔۔۔

بڑے بڑے پلازوں کو کراس کرتا وہ کچھ وقت بعد مطلوبہ جگہ پہ پہنچ گیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے گاڑی روکی۔۔۔۔ اور روڈ کراس کر کے اس طرف گیا جہاں وہ کھڑے تھے۔۔۔۔

وہ وہی کھڑے یہاں وہاں دیکھ رہے تھے

وہ دور سے انہیں دیکھ چکا تھا۔۔۔۔۔

اس لیے ان کی طرف بڑھا تھا۔۔۔۔۔

”وہاں گاڑی کدھر ہے آپ کی۔۔۔۔؟“

انہوں نے گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑائی۔۔۔۔۔

وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔۔۔

”افسوس سے جس وقت آپ نے مجھے بلایا اس وقت تو میں پیدل تھا۔۔۔۔۔

اس نے کمال خوشیاری سے جھوٹ بولا۔۔۔۔۔

”کیا مطلب تم گاؤں سے یہاں تک کیسے آئے۔۔۔۔۔؟“

وہ تعجب کا شکار تھے۔۔۔۔۔

”میں لوکل آیا ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

وہ ایک نظر اسے دیکھ کہ رہ گئے

جیسے کہنا چاہ رہے ہوں کہ پھر تم یہاں کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔“

وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔۔۔۔۔

”مجھے محسوس ہوا اس مشکل وقت میں مجھے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔۔۔۔۔“

وہ احسان جتا رہا تھا

”آپ کو دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ آپ کی فلائیٹ مس ہو جائے گی۔۔۔۔۔“

اس نے تیزی سے یاد دہانی کروائی۔۔۔۔۔

”میرا خیال ہے آپ ٹیکسی بک کروالیں۔۔۔۔۔“

اس نے رائے دی۔۔۔۔۔

وہ دوسرے انسان کا دماغ ٹھکانے لانا جانتا تھا

پلازے سے باہر نکلتی جہاں آرا کی بھٹکتی ہوئی نظریں یکدم سڑک کے کنارے کھڑے

وہاں پہ ٹھہر گئی۔۔۔۔۔ وہ کسی انسان کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔

چہرہ۔۔۔۔۔ کچھ شناسا تھا۔۔۔۔۔

وہ دو قدم قریب گئی۔۔۔۔۔

وہاں سے اس کا آدھا چہرہ دیکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔۔

وہاں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا
وہ چونکی ان کے پیر خود بخود اس طرف اٹھنے لگے۔۔۔۔۔
انہیں محسوس ہوا جیسے نظروں کا دھوکہ ہے۔۔۔۔۔
وہ انسان یکدم کیسے ان کے سامنے آسکتا ہے۔۔۔۔۔
وہ بالکل ویسا تھا جیسے تصویر میں دیکھائی دیتا تھا بس سر کے بال سفید ہو گئے تھے اور
چہرے پہ جھریاں آگئی تھی
اور اس کا وہاں کے ساتھ کیا تعلق ہے۔۔۔۔۔؟
ان کا دماغ مفلوج ہو گیا تھا۔۔۔۔۔
سانس رک گئی تھی
وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔۔۔۔۔
وہ انسان پریشانی سے یکدم پیچھے ہٹا تھا۔۔۔۔۔

وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی تھی
ملازمہ نے بامشکل انہیں سنبھالا تھا۔۔۔۔۔
وہ دونوں ابھی بھی کچھ باتیں کر رہے تھے۔۔۔۔۔
وہ انسان چہرے سے پریشان لگ رہا تھا۔۔۔۔۔
ان کے دماغ میں بار بار ایک ہی سوال گونج رہا تھا
ان دونوں کا کیا تعلق ہے۔۔۔۔۔؟
ان کا دل چاہ رہا تھا وہ آگے بڑھ کے ان کا گریبان پکڑ لے۔۔۔۔۔ کیوں انہوں نے اپنی اولاد کو
لاوارث چھوڑ دیا
لیکن ان کے قدم جم کے رہ گئے تھے۔۔۔۔۔
یکدم وہاں نے آگے بڑھ کے ٹیکسی روکی۔۔۔
وہ شخص وہی کھڑا تھا۔۔۔۔۔

وہاں اب جھک کے ڈرائی پور کو کچھ سمجھا رہا تھا
”چاچا جان۔۔۔۔۔“ یہ آپ کو ائی پر پورٹ چھوڑ دے گا۔۔۔۔۔
اس نے وہی کھڑے کھڑے۔۔۔۔۔ اونچی آواز میں اس شخص کو مخاطب کیا
”وہاں۔۔۔۔۔“ اور زرپاش۔۔۔۔۔“

وہ منہ ہی منہ بڑبڑائی

وہ شخص ناچار و ناچار۔۔۔۔۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کے۔۔۔۔۔ بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ اور گاڑی
زن سے آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔
انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔۔۔۔۔
وہ کیا کریں

پہلے زرپاش کو بتائی یا وہاں کو۔۔۔۔۔

وہاں اب روڈ کر اس کر رہا تھا

وہ جنونی انداز میں اس کی طرف بڑھی۔۔۔۔

”وہاج۔۔۔۔۔“

وہ چیختی۔۔۔۔۔ اور اس طرف دوڑ لگادی۔۔۔۔۔

وہاج نے یکدم پلٹ کے اس برقعہ پوش عورت کو دیکھا۔۔۔۔

اسی لمحے دور سے آتی تیز رفتار گاڑی نے۔۔۔۔۔ جہاں آرا کو کچل دیا۔۔۔۔۔

چہرے سے پردہ اتر ا۔۔۔۔۔ وہ منہ کے بل زمین پہ گری۔۔۔۔۔

وہاج کو ایک لمحہ لگا تھا۔۔۔۔۔

پہچاننے میں

وہ تیزی سے اس طرف لپکا تھا۔۔۔۔۔

اب وہاں لوگ جمع ہو رہے تھے

وہ بھیڑ کو چیرتا آگے بڑھا۔۔۔۔۔

زمین پہ وہ اوندھے منہ پڑی تھی

ان کا سر چہرہ خون کے ساتھ بھرا ہوا تھا

ملازمہ ایک طرف صدمے کے زیر اثر کھڑی تھی۔۔۔۔

وہ گھٹنوں کے بل ان کے قریب بیٹھا۔۔۔۔۔

”ایمبولینس۔۔۔۔۔“

وہ چیخا۔۔۔۔۔

”اسے اپنے ہاتھوں پہ دباؤ محسوس ہوا۔۔۔۔۔۔“

وہ نیم غنودگی میں تھی

سائنس مشکل سے لے رہی تھی۔۔۔۔۔

“وہاج_____”

انہوں نے اٹک اٹک کے کہا۔۔۔۔۔

”زر پ ا ش سے شاد کر لینا۔۔۔۔۔“

انہوں نے بامشکل کہا

وہ منہ کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

عجیب شور تھا۔۔۔۔۔

وہ ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔

انہیں ایمبولینس میں لے کے جایا جا رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ کچھ بھی بول نہیں پارہا تھا

وہ جانتا تھا۔۔۔۔۔

وہ زندگی کی بازی ہار گئی ہیں۔۔۔۔۔

ایک طوائف نے بے پردہ زندگی گزار دی تھی۔۔۔۔۔ لیکن اس کی موت بے پردگی میں

نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔

اس نے ایک نظر ان کے مردہ وجود پر ڈالی ان کے بال ابھی تک دوپٹے میں قید تھے
چہرے پہ سکون تھا۔۔۔۔۔

انہوں اس طوائف کے لیبل سے آزادی مل گئی تھی
میں جو تنہا کبھی چپکے سے بھی رونا چاہوں
تو دل کے دروازے کی زنجیر ہلا دیتا ہے۔۔۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے والے صاف آسمان کو یکدم کالے رنگ کے بادلوں نے گھیر لیا تھا
سرسراتی ہواؤں نے زور پکڑا تھا اور آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی ہر چیز گرد کی صورت
یہاں وہاں اڑ رہی تھی۔۔۔۔۔ چیزوں کے یہاں وہاں گرنے سے عجیب سا شور پیدا ہو گیا
تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دن میں ہی شام کا گمان ہو رہا تھا یکدم پورے کوٹھے میں اندھیرہ چھا گیا
تھا۔۔۔۔۔ شاید بجلی والوں نے یہ موقع غنیمت جانا تھا یا کوئی فیڈر ٹرپ ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

باہر ہوئی یں زور پکڑ رہی تھی اور اندر اس کا دل کسی سہمے بچے کی طرح اندیشوں کو جھٹک رہا تھا
اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردہ کھسکایا باہر نیم اندھیرہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے گرداڑتی
ہوئی دیکھائی دی۔۔۔۔۔ ہوا بے رحمی سے چیزوں کو یہاں وہاں پٹخ رہی تھی
اس نے پردہ دوبارہ برابر کیا دوپٹہ سیٹ کیا چہرے پہ پریشانی کے آثار نمایاں تھے
تھکے تھکے قدم اٹھاتی ساتھ والے کمرے تک گئی
ہلکی سی دستک دی۔۔۔۔۔

اور اندر چلی گئی

اندر تیکے کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھی۔۔۔۔۔ نگار بیگم نے ایک سرسری نگاہ اس کے چہرے
پہ ڈالی وہ چہرے سے فکر مند لگ رہی تھی۔۔۔۔۔
”کیا ہوا ہے زری۔۔۔۔۔“ ”کیوں پریشان ہیں۔۔۔؟“

انہوں نے ناک چڑا کر پوچھا

”وہ اماں جان بازار گئی تھی۔۔۔۔۔ ابھی تک واپس نہیں آئی باہر موسم بھی خراب ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے فکر مندی سے کہتے ہوئے کھنکنیوں سے کھڑی سے باہر دیکھا جہاں ہوائییں زور پکڑ کے آندھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔۔

”ہاں ہم نے جہاں آرا کو فون کیا تھا لیکن اس کا نمبر بند تھا۔۔۔۔۔“

انہوں نے عام سے لہجے میں کہا تو زری کا دل مزید گھبرا گیا اسے پتہ تھا کچھ بھی ہو جائے وہ اپنا نمبر نہیں بند کرتی تھی۔۔۔۔۔

”اور ویسے بھی موسم خراب ہے کہیں رک گئی ہوگی تھوڑی دیر کے لیے آجائے گی۔۔۔۔۔“

انہوں نے اسے بہلا کے جیسے جان چھڑانی چاہی۔۔۔۔۔

وہ مرے مرے قدموں سے جانے لگی

اس نے رندھی ہوئی می آواز میں کہا اور زری کو لگا جیسے یہ چھت اس کے سر پہ آن گرا
ہے۔۔۔۔۔ کسی نے جیسے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈھیل دیا ہے
باہر بجلی زور سے کڑکی اور چھم چھم مینہ برسنے لگا جیسے وہ کسی ایسی ہی خبر کے انتظار میں
تھا۔۔۔۔۔

وہ ہونقوں چہرہ لیے رانی کو دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔۔
جیسے اس کے الفاظ سلب کر لیے گئے تھے
نگار بیگم نے بے یقینی سے رانی کو دیکھا۔۔۔۔۔
”یہ کیسا مذاق ہے۔۔۔۔۔“

وہ رانی کو پرے دھکیل کے کچھ ایسے زور سے دھاڑی کے کوٹھے کے در و دیوار لرز
اٹھے۔۔۔۔۔

سب طوائفیں اپنے حجروں سے نکل کے نگار بیگم کے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔۔۔

یکدم پورا کوٹھا روشن ہو گیا تھا
اور زرباش کی حالت غیر ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔
ہر آنکھ اشکبار تھی مگر جیسے سب کے ہونٹ سل گئے تھے کوئی بھی موت کی وجہ جاننے
کی جرأت نہیں کر رہا تھا
اسی لمحے نگار بیگم کی اس ملازمہ پر نظر پڑی۔۔۔۔۔۔ جو جہاں آرا کے ساتھ گئی تھی اور
اب وہ ہی اس کی موت کی خبر لائی تھی
جو منہ پہ دوپٹہ رکھ کے اپنی سسکیوں کا گلا گھوٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔
”کیا ہوا جہاں آرا کو۔۔۔۔۔۔؟“
آخر یہ ہمت نگار بیگم نے کر ہی لی تھی
لہجے میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا اتنے سالوں کا ساتھ تھا۔۔۔۔۔۔
”وہ ان کا ایکسیڈینٹ ہوا۔۔۔۔۔۔“

وہ بامشکل بول پائی ی پھر رونے لگی۔۔۔۔۔

وہ ملازمہ خاص تھی جہاں آرا کی

”یہ کیا بکو اس ہے ہاں۔۔۔۔۔؟“

اس نے پاس کھڑی ملازمہ کو دھکیلا۔۔۔۔۔

اور سنجیدگی سے بولی۔۔۔۔۔

وہ آنسو پونچتی ہوئی ی لڑکھرائی ی۔۔۔۔۔

”زری بی بی یہی سچ ہے۔۔۔۔۔“

اس نے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے رندھی ہوئی ی آواز میں کہا۔۔۔۔۔

”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔۔۔ وہ مارکیٹ تک گئی ہیں ابھی واپس آجائیں

گی۔۔۔۔۔“ پھر میں سب کی شکایت لگاؤں گی کہ کیسے سب مجھے پریشان کر رہے

تھے۔۔۔۔۔“

وہ سب کو سناتے ہوئے منہ بسور کے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

نگار بیگم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

اسی لمحے کسی کے قدموں کی چاپ سن کے سب اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔۔۔۔۔

اس نے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی

”نگار بیگم ڈیڈ باڈی آگئی ہے۔۔۔۔۔“ آپ کفن دفن کے انتظامات دیکھ لیں ایک

نظر۔۔۔۔۔“

ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے ایک نظر بیڈ پہ منہ بسور کے بیٹھی زرباش کو دیکھا تھا

یہ الفاظ سنتے ہی وہ ہدیانی کیفیت میں اٹھی تھی۔۔۔

”یہ کیا بک رہے ہو تم ہاں تمہیں شرم نہیں آتی میری ماں کے بارے میں ایسی بات کرتے

ہوئے۔۔۔۔۔“

اس نے آگے بڑھ کے اس کا گریبان پکڑ لیا۔۔۔۔۔

”وہ نہیں مر سکتی سنا تم نے۔۔۔۔“

انہوں نے کہا تھا کہ وہ واپس آئی بینگی اور تم کہہ رہے ہو ڈیڈ باڈی۔۔۔۔۔“

اس نے اب کی بار چلا کے سختی سے کہا تھا

”زری۔۔۔۔۔“ میری بات سنو۔۔۔

اس نے زری سے کہتے ہوئے اسے دونوں شانوں سے تھاما۔۔۔۔

اس نے اس کا ہاتھ جڑک دیا

”ہٹو پیچھے۔۔۔۔۔ میں تمہاری اب کسی بات میں نہیں آؤں گی تم ہی ہمارے دشمن ہو ہمیں

خوش نہیں دیکھ سکتے اب جھوٹی کہانیاں گڑھ رہے ہو۔۔۔۔۔“

اس نے اسی طرح اس کا گریبان پکڑے ہوئے تڑت کے کہا

آنکھیں خشک تھی۔۔۔۔

”نہیں مر سکتی وہ۔۔۔۔۔“

”نہیں مر سکتی۔۔۔۔۔“

وہ چلا رہی تھی

اور وہاں سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

اس نے اسے شانوں سے پکڑ کے ایک ذوردار تھپڑ اس کے گال پہ جھڑ دیا۔۔۔۔۔

ماحول میں سکوت چھا گیا

وہ گال پہ ہاتھ رکھ کے بے یقینی سے۔۔۔۔۔ اسے دیکھنے لگی

”مرگئی ہیں وہ۔۔۔۔۔ اب واپس نہیں آئیں گی باہر لاش پڑی ہے ان کی سنبھالو خود کو

ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔

التجائی یہ لہجے میں کہتے ہوئے۔۔۔۔۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔۔۔۔۔

اس نے ایک نظر وہاں کو دیکھا تھا

پھر اس کے سینے کے ساتھ جا لگی تھی

”اماں جان چھوڑ کے چلی گئی مجھے۔۔۔۔۔“

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح کہا
وہ اس کے ریشمی بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کسی بچے کی طرح بہلا رہا تھا۔۔۔۔۔
باہر بارش ابھی بھی برق رفتاری کے جاری تھی
اور اندر اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔۔۔۔۔



تم نے جانچا ہے محض لوگوں کو
تم نے دلوں میں کب جھانکا ہے۔۔۔۔۔
شام کے گہرے سائے کسی آسیب کی طرح۔۔۔۔۔ اس کو ٹھٹھے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے
آج وہ بتیاں نہیں چمک رہی تھی کوٹھارے پر ان پڑا تھا۔۔۔۔۔ آج ڈھول کی تھاپ کے بجائے
محض آہ وزاری اور سسکیوں کی آواز آرہی تھی کوئی گلا پھاڑ کے رو رہا تھا۔۔۔۔۔

”کوئی ی بین کر رہا تھا۔۔۔۔۔

ایک طرف کونے میں نگار بیگم سفید رنگ کی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی چہرہ آج میک آپ سے
عاری تھا۔۔۔۔۔

وہ نزاکت سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی

درمیان میں جہاں آرا کے میت کی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

کفن کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ۔۔۔۔۔ مردہ آنکھوں سے زری دیکھے جا رہی تھی
ملجگا لباس بکھرے بال سوجی ہوئی متورم آنکھیں۔۔۔۔۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں
تھا۔۔۔۔۔

وہ پتہ نہیں ان کے چہرے پہ کیا کھوج رہی تھی

یہ وہی طوائف تھی۔۔۔۔۔ جو جب زندہ تھی تو اس کی ایک جھلک کے لیے لوگ مرتے
تھے۔۔۔۔۔ درحقیقت وہ عورت تھی اور حیثیت اس کی نہیں اس کے جسم کی تھی آج وہ

مردہ تھی۔۔۔۔۔ وہ طوائف تھی رقصہ تھی اس کے جنازے میں شراکت تو

دور۔۔۔۔۔ نماز جنازہ پڑھانے سے لوگ انکاری تھے۔۔۔۔۔

اس مشکل وقت میں ایک وہاں ہی تھا جو ہر کام بخوشی باخوبی سرانجام دے رہا تھا۔۔۔۔۔

اس نے لوگوں کی زبان پہ اپنی ماں کے لیے اتنے ہتک آمیز جملے سنے تھے کہ۔۔۔۔۔ کہ

جہاں آرا کو اکثر لگتا تھا کہ جب وہ مر جائی ینگے تو ان کا جنازہ پڑھنے والا کوئی ی نہیں ہو

گا۔۔۔۔۔ ان کے جنازے کو کندھا دینے والا کوئی ی نہیں ہو گا۔۔۔۔۔

دنیا انہیں طوائف کہتی تھی لیکن زرباش نے انہیں رات کو جاگ جاگ کے اللہ کے حضور

روتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

تب ہی ان کے چہرے پہ ایک ٹھہرا ہوا سکون تھا۔۔۔۔۔

”نگار بیگم۔۔۔۔۔ جنازہ لے کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

سڑھیاں چڑ کے اوپر آتے وہاں نے ایک نظر جہاں آرا کے میت کے ساتھ لپٹی زرباش کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔۔۔۔۔

”وہ بھی اسی زمانے کا مرد ہے۔۔۔۔۔ وہ کیوں نہیں کرہت کھا رہا وہ کیوں۔۔۔۔۔ ایک نارمل انسان کی طرح جہاں آرا کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکائے ہوئے سوچا تھا
”ہاں لے جاؤ جنازہ۔۔۔۔۔“

انہوں نے زرباش سے نظریں چراتے ہوئے اجازت دی تھی۔۔۔
وہ یکدم آگے بڑھا تھا ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے جو شاید اسی کے توسط سے آئے تھے
”خبردار۔۔۔۔۔“ کوئی ی بھی آگے نہیں بڑھے گا۔۔۔۔۔“

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی
دونوں بازو پھیلا کے چارپائی کے آگے کھڑی ہو گئی تھی

”میری اماں جان کو کوئی ہی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا

وہ چیخی تھی

وہاں نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔

پھر رانی کو اور نگار بیگم کو اشارہ کیا تھا

وہ تیزی سے اس طرف بڑھی اور اسے دونوں طرف سے پکڑ لیا

وہ جنازے کو کندھا دے کے لے کے جانے لگا

وہ جنازے کے پیچھے جانا چاہتی تھی

لیکن اسے مضبوطی سے دونوں نے تھام رکھا تھا

پہلی بار اس کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی تھی۔۔۔۔۔

پھر وہ گلا پھاڑ کے رونے لگی تھی

پہلی بار جہاں آرا نے زرباش کے رونے کی آواز سنی تھی اور وقت رخصت جو آخری آواز
انہوں نے سنی تھی۔۔۔۔۔

وہ زری کے رونے کی تھی۔۔۔۔۔

”اماں جان۔۔۔۔۔ کدھر جا رہی ہیں اپنی زری کو اکیلا چھوڑ کے۔“

وہ دہائیاں دے رہی تھی

لیکن یہاں اس کے آنسوؤں سے پگھلنے والا کوئی بھی موجود نہیں تھا

یکدم وہ تیور کے گری اور بے ہوش ہو گئی

تمام عورتیں اس کی طرح لپکی تھی



سنو آہٹ نہیں کرنا

ابھی ہی درد سویا ہے۔۔۔۔۔

جولائی کے اوائل دنوں کی چلچلاتی دھوپ میں۔۔۔۔۔ دھوپ اپنا سایہ زمین پہ بکھیر رہی
تھی جس بھری اس ہوا میں سانس لینا محال تھا۔۔۔۔۔

بے چینی سے یہاں وہاں چکر کاٹتے وہاج نے تیسری بار بند دروازے کو دیکھا تھا۔۔۔۔۔
یکدم دروازہ کھلا تھا اور رانی باہر نکلی تھی

ایک کاٹ دار نگاہ وہاج پر ڈالی اور آگے بڑھنے لگی جب وہاج نے اس کا راستہ روک لیا
”ہوش آیا اس کو۔۔۔۔۔؟“

لہجے میں فکر مندی تھی

وہ تپش بھری نظروں سے اسے گھور کر رہ گئی

بخار اتر گیا ہے ڈاکٹر کہہ رہی ہے تھوڑی دیر تک ہوش آجائے گا۔۔۔۔۔“

وہ نپے تلے انداز میں بتاتی اپنا اندرونی خلفشار چھپاتی آگے بڑھ گئی

وہ تھکے تھکے انداز میں کھڑا نچلا لب کچلنے لگا۔۔۔۔۔

آج تیسرہ روز تھا اور زری کو ہوش نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔

پتہ نہیں جہاں آراۓ کی موت کے بعد اسے اس لڑکی سے ہمدردی ہوگئی تھی

کم از کم وہ تو یہی سمجھا تھا۔۔۔۔۔

یکدم دروازہ کھلا۔۔۔۔۔

اور نگار بیگم کمرے سے باہر آئی

ایک اچنی نگاہ۔۔۔۔۔ وہاں پر ڈالی

”نگار بیگم مجھے آپ سے بات کرنی ہے

سنجیدہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے ان کی طرف پیش قدمی کی تھی

جو مغرور سے انداز میں کھڑی تھی

”جہاں آراۓ جی کے آخری الفاظ تھے کہ میں زریپاش سے نکاح کر لوں۔۔۔۔۔“

اس نے سنجیدگی سے کہہ کے ان کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

ان کے چہرے پہ سائے لہرانے لگے۔۔۔۔

البتہ وہ اپنے تاثرات چھپاگئی۔۔۔۔۔

”وہ تمہیں ایسا نہیں کہہ سکتی وہ تمہیں سخت ناپسند کرتی تھی“

انہوں نے نخوت سے کہا۔۔۔۔

”میرے پاس ثبوت بھی ہے۔۔۔۔۔“ لیکن وہ ثبوت میں زرپاش کے سامنے پیش کروں

گا۔۔۔۔۔

وہ استہزائی یہ مسکرایا

اور ان کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔۔۔۔

وہ ان کے ارادے بھانپ چکا تھا۔۔۔۔۔

”کچھ بھی کرنے سے پہلے یہ بات یاد رکھیئے گا کہ اگر جہاں آراۓ مرگئی ہے تو اب اس کا کوئی نہیں رہا اس دنیا میں آپ اس سے الٹا سیدھا کچھ بھی کروالینگی۔۔۔۔۔۔“ جب تک وہاں زندہ ہے کوئی تیرھی آنکھ سے بھی اسے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔“ وہ انگارے اگلتی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے انگلی اٹھا کے تنبیہ کر کے آگے بڑھ گیا اس کی نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ وہ سہم کے رہ گئی۔۔۔۔۔۔“ اندر کمرے میں وہ پڑمردہ چہرہ لیے چھت کو گھور رہی تھی۔۔۔۔۔۔“ پاس بیٹھی ذرینہ ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی ”صبر کریں بی بی جی۔۔۔۔۔۔“

ذرینہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔۔۔۔

ساتھ ہی پھر دوپٹے میں چہرہ چھپا کے رونے لگی۔۔۔۔۔۔

زرباش خاموش رہی۔۔۔۔۔۔

”صبر نہیں آتا مجھے۔۔۔۔۔ شکوہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔۔۔ کہ میں ہی کیوں اللہ ہر چیز
مجھ سے کیوں لے لیتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ کہنیوں کے بل اٹھی اور پیچھے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگالی۔۔۔۔۔
اور تڑپ کر گویا ہوئی۔۔۔۔۔

”زری بی بی اللہ بہترین حکمت عملی کرنے والا ہے۔۔۔۔۔“
حوصلہ رکھیں۔۔۔۔۔

اللہ بہتر کرے گا

وہ اسے تسلی دینے لگی

وہ خاموش ہو گئی

”زری بی بی ہے تو یہ۔۔۔۔۔ وقت نہیں ایسی بات کرنے کا لیکن۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے جتنا
جلدی آپ کو بتایا جائے بہتر ہے۔“

وہ رازداری سے اس کے قریب ہوئی

”جہاں آرا بی بی کے آخری الفاظ تھے کہ۔۔۔۔۔۔ وہاں آپ سے شادی کر لیں۔۔۔۔۔۔“

یہ الفاظ کسی بم کی طرح اس کے اعصابوں پر گرے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا

وہ یکدم اس طرف متوجہ ہوئی

”ہاں زری بی بی جہاں آرا بی بی نے وہاں صاحب کو کسی مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ

بہت بے چین ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ اسی لیے وہ وہاں صاحب سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن

قسمت نے یاری نہ کی۔۔۔۔۔۔“

وہ دکھ سے اسے ساری کہانی سنارہی تھی۔۔۔۔۔۔

وہ پر سوچ نظروں سے بس اسے دیکھ رہی تھی

”اور جہاں آرا بی بی کا سانس بھی وہاں صاحب کی گود میں نکلا۔۔۔۔۔۔“

یہ نئے انکشاف تھے جو اس لمحے اس پر ہوئے تھے

”جہاں آرا نے وہاں کو کس مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ وہاں سے کیوں
بات کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔“ اور آخری لمحے انہوں نے کیوں وہاں سے شادی کا
کہا۔۔۔۔۔؟“

بہت سے سوال تھے لیکن جواب صرف۔۔۔۔۔ وہاں کے پاس تھا۔۔۔۔۔



شاید یہی اس کا اندازِ محبت ہو

وہ میرا ہدم تھا ستم گزار بھی تھا

جس لمحے وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔۔۔۔۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے کوٹھے

میں ہنوز سکوت تھا۔۔۔۔۔ دور کہیں مغرب کی آذانیں فضا میں رس گھول رہی

تھی۔۔۔۔۔ چھت کے ساتھ لٹکتا پنکھا فل اسپید سے چل رہا تھا وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا

کے آنکھیں موندے لیٹی تھی اس کے قدموں کی چاپ سن کے اس نے فٹ سے آنکھیں
کھولی تھی

سامنے سرمئی رنگ کے کاٹن کے سوٹ اوپر واسکوٹ پہنے ایک شان بے نیازی سے اس کے
سامنے کھڑا تھا

اس سے یکسر مختلف جیسا وہ بچھے دنوں تھا

وہ پھر وہی پرانا والا مغرور وہاج بن گیا تھا

ایک اچنی نگاہ اس کے ذرد چہرے پہ ڈال کے وہ کرسی کھینچ کے قریب بیٹھ گیا۔۔۔۔

”طبیعت کیسی ہے اب تمہاری۔۔۔۔؟“

اس نے لا پرواہی سے پوچھا۔۔۔۔

”ٹھیک ہوں اب۔۔۔۔“

وہ نحیف سا مسکرائی

اس نے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔۔۔۔۔

”اماں جان نے آخری دفعہ آپ کو کس کے ساتھ دیکھا تھا۔۔۔۔۔؟“

وہ آہستہ آواز میں سوالیہ لہجے میں بولی تھی

وہ چونکا تھا۔۔۔۔۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

بھنویں اچکا کے پوچھا گیا تھا۔۔۔۔۔

”کیوں کے اس کے بعد وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔“

اس نے گہری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے جیسے اسے آگاہ کیا

خلاف توقع وہ ذور سے ہنسا۔۔۔۔۔۔۔

زیرپاش کو وہ اس وقت سخت زہر لگا تھا۔۔۔۔۔

تم یہ بات-----لے کے بیٹھ گئی ہو-----میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی
بڑی خبر ہے-----“

وہ مسکراتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولا

وہ ناگواری سے اسے دیکھ کے رہ گئی

ایک لمحے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ہمدرد ہے اور اگلے ہی لمحے وہ تماشاخی بن جاتا
تھا-----

وہ کبھی اسے سمجھ نہیں پائی تھی

”آپ کی امی کی آخری خواہش تھی کہ آپ ہم سے شادی کر لیں-----“

بظاہر سنجیدگی سے بھی کہتے ہوئے وہ کہیں سے بھی سنجیدہ نہیں لگ رہا تھا-----

”اب دیکھو پہلے یہ میری خواہش تھی اب یہ آپ کی امی حضور کی آخری خواہش بھی بن گئی

ہے اب بھی اگر تم انکار کرو تو تم نہایت کوئی خود سر لڑکی ہو-----“

اس نے براسا منہ بنا کے۔۔۔۔۔ اسے۔۔۔۔۔ شرم دلانی چاہی۔۔۔۔۔

”میرا کام تھا تمہیں آگاہ کرنا آگے تمہاری مرضی

وہ بال اس کے کوٹ میں ڈال کے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اس کے الفاظ اس کی سماعتوں کے ساتھ ٹکرائے۔۔۔۔۔

”ہم تیار ہیں آپ تیاری کروائی یں نکاح کی ہم آج ابھی اور اسی وقت نکاح کریں

گے۔۔۔۔۔ اگر آج نہیں تو پھر کبھی نہیں۔۔۔۔۔“

وہ مضبوط لہجے میں۔۔۔۔۔ گویا ہوا۔۔۔۔۔

”جو حکم سرکار کا۔۔۔۔۔“

وہ دل و جاں سے مسکرایا

اور پھر واقعی ہی۔۔۔۔۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے سارے انتظامات مکمل کروائے

تھے۔۔۔۔۔

نگار بیگم چاہ کے بھی کچھ نہیں کر سکی تھی

اور نکاح کے ان تین بولوں سے وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہو گئے تھے
اس کا دل ہر احساس سے عاری تھا۔۔۔۔۔

نکاح کے بعد۔۔۔۔۔ وہ جانے لگا تو۔۔۔۔۔ نگار بیگم نے بے اسے حیرت سے
دیکھا۔۔۔۔۔

”آپ کدھر جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”حویلی۔۔۔۔۔“

اس نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔۔۔۔۔

”اور زریپاش کدھر رہے گی۔۔۔۔۔؟“

ان کے لہجے میں ہنوز حیرت تھی۔۔۔۔۔

”کیا مطلب کدھر رہے گی۔۔۔۔۔؟“ یہی رہے گی جدھر پہلے رہتی تھی۔۔۔۔۔

کمرے کے اندر کھڑی زرباش دم سادھے اس شخص کے الفاظ سن رہی تھی جو کچھ دیر پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔۔۔۔۔

”لیکن اب تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔؟“

نگار بیگم اپنی بات پہ زور دے کے بولی

”تو شادی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں اسے بیوی کا درجہ دے دوں۔۔۔۔۔“

وہ ڈھٹائی سے بولا

تو اندر کھڑی زرباش کی آنکھیں برس پڑی۔۔۔۔۔

وہ یہی رہے گی۔۔۔۔۔ کبھی کبھی آ کے مل لوں گا

تیزی سے کہہ کے وہ سڑھیاں اتر گیا۔۔۔۔۔

نگار بیگم بے یقینی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔۔۔۔۔

اور زرباش نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھتی وہاں کو درد بھری نظروں سے دیکھا

پہلے وہ اپنا نہیں تھا تو اس کی بے رخی تکلیف بھی نہیں دیتی تھی اور
آج۔۔۔۔۔ زر پاش۔۔۔۔۔ کو لگا کسی نے اس کی روح نکال لی ہے۔۔۔۔
پتہ نہیں اب وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا
وہ وہی صوفے پہ ڈھ گئی



شام کا ہلکا ہلکا اندھیرہ جیسے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔۔۔۔۔ آسمان پہ بر آجمن سورج پر درہ پوشی کی تیاری میں محو ہو کے مدہم ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ کوٹھے پہ لٹکی رنگ برنگی جلتی بجتی بتیاں۔۔۔۔۔ ہلکی ہلکی روشنی بکھیرنے میں مصروف تھی۔۔۔۔۔ ایسے میں کوٹھے میں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔۔۔۔۔

بڑی کمرے میں نگار بیگم بمعہ بہت سی طوائی فوں کے کسی ہنگامی میٹینگ میں مصروف تھی جس سے کمرے میں بیٹھی اداس سی زرباش بے خبر تھی

”ایسے میں ملازمہ کے منہ سے نکلے الفاظ بجلی کی طرح اس کی سماعتوں پر گرے

تھے۔۔۔۔۔“

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے گردن گھما کے پیچھے کھڑی ملازمہ کو دیکھا۔۔۔۔۔

اس کے پاؤں سے گھنگھر و اتارتے ہاتھ یکدم ساکت ہوئے۔۔۔۔۔

وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی

ہاتھ میں پکڑے گھنگر و زمین بوس ہوئے۔۔۔۔۔

وہ بالکل اس کے مقابل آ کے کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔

ملازمہ گھبرا گئی۔۔۔۔۔

”کیا کہا تم نے۔۔۔۔۔؟“

اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہو۔۔۔۔۔

”جی بی بی جی۔۔۔۔۔ وہ کل شام میں زرپاش بی بی کا نکاح و ہاج صاحب سے ہو گیا۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکا کے ذرا سہم کے اطلاع دی۔۔۔۔۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔۔۔۔۔ جیسے وہ بالکل یہ ماننے سے انکاری ہو۔۔۔۔۔

”ایسا ہو گیا ہے بی بی جی۔۔۔۔۔“

ملازمہ قریب آ کے رازداری سے گویا ہوئے

انداز سر اسر لگائی بجھائی والا تھا

”تم نے اس وقت ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی۔۔۔۔۔“

وہ غصے سے پلٹی اور اسے گھور کے دیکھا وہ سہم گئی۔۔۔۔۔

”وہ بی بی جی آپ دوسرے شہر تھی اتنی جلدی میں آپ کیسے آ سکتی تھی۔۔۔۔۔؟“

اس نے گڑبڑا کے فوراً صفائی دی۔۔۔۔۔

منہ بند رکھو اپنا۔۔۔۔۔

وہ اسے جھاڑ پلا کے وہی سر تھام کے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”وہاں یوں تو بڑی باتیں کرتا تھا کہ وہ طوائی فوں کے بہت خلاف ہے اب ایک طوائی ف کو ہی گھر کی زینت بنالیا۔۔۔۔۔“

وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔۔۔۔۔

”نہیں بی بی جی صرف نکاح کیا ہے گھر کی زینت نہیں بنایا مجھے تو معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے۔۔۔۔۔“

ملازمہ اب کی بار پھر رازداری سے بولی اور اپنی طرف سے ایک بڑی خبر اس کے گوش گزار کی۔۔۔۔۔

”کیا مطلب کیا وہ اسے ساتھ نہیں لے کے گیا۔۔۔۔۔؟“

وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

ملازمہ کے کہنے پہ اس کی آنکھیں چمک اٹھی۔۔۔۔

”بس یہی اوقات تھی اس کی۔۔۔۔۔“

وہ استہزائی یہ ہنسی۔۔۔۔

”اوقات تو میں یاد کرواؤں گی اسے اس کی۔۔۔۔۔ وہ کیا سمجھتی ہے اتنی آسانی سے میں وہاں

کو اس کا ہونے دوں گی۔۔۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔۔۔“

وہ پلٹ کے فوراً ہر خند لہجے میں بولی۔۔۔۔

اس کی نظروں میں ایک عجیب سا تاثر تھا ملازمہ کو اس سے خوف آیا۔۔۔۔۔

”کتے والی موت ماروں گی میں اس کو۔۔۔۔۔“

وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کے چبا چبا کے بولی۔۔۔۔۔

تو ملازمہ نے دل ہی تھام لیا

”بی بی جی ذرا دیکھ کے۔۔۔۔۔ اب وہ وہاج صاحب کی بیوی ہیں۔۔۔۔۔“

ملازمہ نے اسے خوف دلانے کی غرض سے کہا۔۔۔۔۔

”ہاں تو کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ اگر اتنا ہی اس کو کوئی می درجہ دینا ہوتا یوں چھوڑ کے نہ جاتا اسے“

وہ طنزیہ بولی۔۔۔۔۔

”اور میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔“

وہ فوراً اسے کچھ سمجھانے لگی ملازمہ کے تاثرات یکدم بدلے

اس کا رنگ زرد ہوا اور آنکھوں میں خوف کے تاثرات دیکھائی دیں لگے

لیکن سامنے کھڑی لڑکی پتہ نہیں انتقام کے کس درجے پہ تھی۔۔۔۔۔



موت تیری طلب بھی لغزش لب

زندگی تیرا اعتبار بھی جھوٹ۔۔۔۔۔

رات کے اس آخری پہر جب ہر طرف گہری سنگین خاموشی کا راج تھا۔۔۔۔۔ اور رات کے گہرے سائے اس حویلی کے در و دیوار پہ منڈلا رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ بڑے کمرے کے اس اسٹائیلش سے بیڈ پہ مضطرب انداز میں کروٹیں بدل رہا تھا کبھی یوں ہی اٹھ کے بیٹھ جاتا۔۔۔۔۔

وہ بے چین سادیکھائی دے رہا تھا اسے وہاں چھوڑ کے آئے ہوئے اسے۔۔۔۔۔ دو دن گزر گئے تھے

ان دو دنوں میں اس نے خود کو مصروف رکھنے کی بے حد کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے خیال کو جھٹک نہیں پایا تھا

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہتا وہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرے لیکن اس کی انا اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی

اسے اپنی تذلیل کا وہ لمحہ یاد آجاتا پھر جیسے ہر ایک جذبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔۔۔۔۔

دوراتوں سے وہ ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا

پہلے بات اور تھی لیکن اب وہ اس کی بیوی تھی

جو ایک ایسی جگہ پہ تھی جو بدنامی کی وجہ سے مشہور ہے۔۔۔۔۔

اور یہ بات اس کے لیے ڈوب مرنے کی تھی۔۔۔۔۔

کچھ سوچ کے اس نے پاس پڑاسائی یڈلیمپ جلا یا۔۔۔۔۔ گھڑی رات کے دس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔۔۔۔۔

اس نے سائی یڈ ٹیبل سے موبائی ل فون ٹولا۔۔۔۔۔

اور کسی کا نمبر ڈائی ل کرنے لگا۔۔۔۔۔

دو تین دفعہ ٹرائے کرنے کے بعد بھی کال پک نہیں ہوئی ی تو وہ جھنجھلا گیا۔۔۔۔۔

شاید نگار بیگم سوگئی تھی۔۔۔۔۔

کچھ سوچ کے وہ اٹھاسائی یڈ سے چابیاں اٹھائی اور۔۔۔۔۔ کمرے سے باہر نکلتے نکلتے کچھ سوچ کے رک گیا

رات کے اس وقت گھر سے نکلنا ٹھیک نہیں تھا
اس کا صبر بس اب اتنا ہی تھا۔۔۔۔۔

انا کو بھاڑ میں جھونک کے اس نے یہ تہیہ کیا کہ وہ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی
----- زرپاش کو وہاں سے نکال لائے گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔۔۔۔۔
رات کے اس پہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوٹھے میں بھی مکمل خاموش تھی۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ کھڑکی سے باہر پورے چاند کو دیکھ رہی تھی ذہن بار بار بھٹک کے اس دشمن جاں
کی طرف چلا جاتا تھا جو کہنے کو تو اس کا شوہر تھا لیکن اس نے پلٹ کے اس کی خبر نہیں لی تھی
دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا اس نے بید روی
سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالی۔۔۔۔۔

اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ سجا کے پٹی۔۔۔۔۔

سامنے ملازمہ دودھ کا گلاس لے کے کھڑی تھی

وہ اس کی ملازمہ نہیں تھی بلکہ رانی کی ملازمہ تھی وہ تھوڑی حیران ہوئی

”ارے سفینہ۔۔۔۔۔ تم کیسے۔۔۔۔۔“؟ نصیبیاں کدھر ہے۔۔۔۔۔“

اس نے دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے سرسری سا پوچھا

پہلے تو وہ گھبرائی لیکن پردے کی اوٹ سے رانی کے چہرے کی سختی کو دیکھ کے اس نے فوراً

اپنی گھبراہٹ پہ قابو پا لیا۔۔۔۔۔

زرپاش کی ساری توجہ ہاتھ میں پکڑے دودھ کے گلاس پہ تھی۔۔۔۔۔

”بی بی جی وہ کچن میں تھوڑا کام کر رہی تھی میں رانی بی بی کے لیے لے کے جا رہی تھی

۔۔۔۔۔ سوچا اس کی تھوڑی مدد کروں۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے کی لرزش واضح تھی

جو دماغی الجھن کی وجہ سے زریپاس محسوس نہ کر سکی۔۔۔۔۔

اور چپ چاپ سر ہلا کے دودھ کا گلاس لبوں کے ساتھ لگا لیے

پردے کے پیچھے کھڑی رانی کو اپنے اندر تک سکون اترتا محسوس ہوا۔۔۔۔۔

اس کی حسد کو تسکین مل رہی تھی

ملازمہ نے عجیب سی گھبرائی ہوئی نظروں سے زریپاش کی طرف دیکھا جو گلاس خالی کر چکی تھی

اس کے ہاتھ سے گلاس لے کے وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔۔۔۔۔

ایک سہمی ہوئی نگاہ رانی پہ ڈالی۔۔۔۔۔

جو مسکرا رہی تھی

اور وہ ہاتھ میں ٹرے پکڑے آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔

اس کے باہر نکلتے ہی۔۔۔۔۔ وہ جیسے ہی اٹھ کے کھڑی ہوئی اس کا سر گھومنے لگا

وہ لڑکھڑا کے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔۔۔۔۔
اس نے بیڈ کے کنارے کو پکڑ کے بامشکل خود کو سنبھالا
کمرے کا چھت اسے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا
اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔۔۔۔۔
ناک سے خون بہنے لگا۔۔۔۔۔
اس نے دہشت بھری نظروں سے ارد گرد دیکھا
اور پھر وہ یکدم زمین بوس ہوئی۔۔۔۔۔
اندر آتی ملازمہ نے۔۔۔۔۔ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھا۔۔۔۔۔



میں بھی اپنے آپ کو بھلائے ہوئے پھرتا ہوں بہت
آئی نہ اس نے بھی نہ دیکھا ہو گا کچھ روز۔۔۔۔۔

اگست کے اوائل دنوں میں اب ہوا میں جس تھا۔۔۔۔۔ بڑی حویلی صبح کے وقت گرم
ہواؤں کے حصار میں تھی۔۔۔۔۔ آج معمول سے ہٹ کے وہ ذرا جلدی جاگ گیا
تھا۔۔۔۔۔ اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنے اوپر پر فیوم اسپرے کر رہا تھا
سفید رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں اوپر سلور واسکوٹ پہنے بالوں کو ایک ترتیب سے سیٹ کر
رکھا تھا بہت ہشاش بشاش لگ رہا تھا

وہ آج زرپاش کو لینے جا رہا تھا ابھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے حویلی لائے گا یا نہیں
ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کا موبائی ل بج اٹھا
اسکرین پہ چمکتے نگار بیگم کے نمبر کو دیکھ کے وہ الرٹ ہوا۔۔۔۔۔
آگے موجود خبر نے اس کے ہوش اڑادیئے تھے۔۔۔۔۔ اس کے اعصاب تن گئے ماتھے
پہ پڑے بل اور نمایاں ہوئے اور کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔۔۔۔۔
اس نے کال کاٹ کے موبائی ل جیب میں ڈالا۔۔۔۔۔

اور کسی میزائی ل کی طرح حویلی سے نکلا

رف ڈرائی یونگ کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھے کے سامنے تھا

اس کے سر پہ جیسے خون سوار تھا

”کدھر ہے میری بیوی۔۔۔؟“

وہ طیش کے مارے سیڑھیاں چڑھتا۔۔۔۔۔ سینہ تان کے خوفزدہ سی نگار بیگم کے سامنے آکھڑا

ہوا۔۔۔۔۔

”وہاج دیکھیں آپ میری بات دھیان سے سنیں۔۔۔۔۔“

نگار بیگم نے اسے ٹھنڈہ کرنے کی غرض سے۔۔۔۔۔ لہجہ دھیمار کھ کے مصلحت آمیز رویہ

اپنایا۔۔۔۔۔

لیکن سامنے موجود شخص۔۔۔۔۔ جیسے غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے

انگارے نکل کے نگار بیگم کے وجود کو بھسم کر رہے تھے۔۔۔۔۔

”میں نے پوچھا میری بیوی کدھر ہے۔۔۔۔۔“

اس دفعہ وہ کچھ اتنے ذور سے دھاڑا کہ۔۔۔۔۔ کہ کوٹھے کے درو دیوار ہلا گیا

نگار بیگم سہم کے دو قدم پیچھے ہٹی

”ہسپتال لے کے گئے ہیں انہیں۔۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا۔۔۔۔۔

”ایک بات بتادوں میں نگار بیگم۔۔۔۔۔ اگر میری بیوی کو کچھ بھی ہوا تو میں کسی کو نہیں

چھوڑوں گا ایک ایک شخص کو اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔۔۔۔۔ وہ لاوارث نہیں ہے

وہاں خان کی بیوی ہے۔۔۔۔۔“

وہ جار خانہ انداز میں چیخا اور ساتھ ہی خون آلودہ نظروں سے انہیں دیکھتے

ہوئے۔۔۔۔۔ سیڑھیاں اتر گیا

وہ ماتھے پہ آئے پسینے کے ننھے قطروں کو صاف کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی نظروں سے
اسے جاتا دیکھتی رہی



لوگوں نے اس کو میری محبت سمجھ لیا
محسن وہ مجھے جان سے پیارا تھا بس

جس وقت وہ۔۔۔۔۔ ہسپتال کی اس بڑی سی عالیشان عمارت کے سامنے پہنچا اس وقت اگست
کی شدید گرمی کا سورج شدت اختیار کر چکا تھا اور اس آگ برساتے سورج کے نیچے وہ تنے
ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا تھا ایسے لگتا تھا جیسے اس کی رگ رگ میں کسی نے زہر بھر دیا
ہے۔۔۔۔۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہسپتال کے اندر داخل ہوا ر سیشن پہ موجود لڑکی سے زرپاش کے وارڈ کا
پوچھ کے اس سمت بھاگا۔۔۔۔۔

وارڈ کے سامنے ہی کچھ ملازمہ اور رانی کھڑی تھی

سامنے سے وہاں کو آتا دیکھ کے اس کے ماتھے پہ ناگواری کی لکیریں واضح ہوا۔۔۔۔۔

وہ رانی کو یکسر نظر انداز کر کے کمرے سے نکلتے ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔۔۔۔۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔ میری وائی ف کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟

اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ چہرے سے بہت بے چین لگتا تھا۔۔۔۔۔

”وہاں صاحب ہم نے ان کا معدہ واش کر دیا ہے وہ اب خطرے سے باہر ہیں۔۔۔۔۔“ آپ

کچھ وقت بعد ان سے مل سکتے ہیں۔۔۔۔۔

پرانی شناسائی کی وجہ سے ڈاکٹر فرقان فوراً وہاں کو پہچان گئے تھے

اسی لیے اسے فوراً مطمئن کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔۔۔۔۔

یہ الفاظ سن کے اس کے تنے ہوئے اعصاب کافی پر سکون ہو گئے اس نے دل ہی دل میں

اللہ کا شکر ادا کیا۔۔۔۔۔

رانی نے بیزاری سے سے اسے دیکھا پھر منہ ہی منہ بڑبڑائی
اسی لمحے وہاں پیچھے مڑا۔۔۔۔

جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اسے بازو سے دبوچا اور ایک طرف لے گیا۔
اس فوری افتاد پہ وہ فوراً گھبرا کے ہر اسان نظروں سے اسے دیکھنے لگی
جس کی آنکھوں سے اسے خوف آرہا تھا
”یہ تمہاری حرکت ہے نا۔۔۔۔“

وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔۔۔۔

وہ اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کے فوراً گھبرا گئی لیکن یکدم خود کو سنبھال لیا
”وہاں چھوڑیں مجھے میں کیوں کروں گی ایسا؟“
وہ انجان بن کے اپنا بازو چھڑوانے لگی۔۔۔۔

”رانی میں قسم کھا کے کہتا ہوں اگر اس سب میں تمہارا ہاتھ نکلاتو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے
زمین میں گاڑ دوں گا۔۔۔۔۔“

اس نے جارحانہ انداز میں اسے پرے دھکیلا۔۔۔۔۔
اس نے بامشکل خود کو سنبھالا
وہ اسے تنبیہ کر کے آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔



ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا

ورنہ ہمارے دکھ جو تھے اتنے لادوانہ تھے۔۔۔

ملکہ کوہسار کے اس اونچے قد آور درختوں پہ جیسے سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور
آسمان سے روئی کی گولے مسلسل برس رہے تھے سڑک کے کنارے پہ برف کے ڈھیر
تھے اور درختوں پہ سفید تہہ جمی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

ایسے میں گھنے جنگل کے ایک طرف بنے اس پتھروں کے چھوٹے سے مکان
میں۔۔۔۔۔ آگ جل رہی تھی۔۔۔۔۔

آگ کے ایک طرف بیٹھا ایک شخص سر جھکائے نہایت ادب سے۔۔۔۔۔ بیٹھا ہمہ تن گوش
تھا

وہ اپنے حوالے سے۔۔۔۔۔ پاکستانی نہیں لگتا تھا اس کے نین نقوش بھی مختلف تھے۔۔۔۔۔

سفید رنگ کی شرٹ نیچے بلیک جینز اوپر بلیک کوٹ پہنے وہ سر جھکا کے بیٹھا تھا
دوسری طرف بیٹھے اس باریش شخص نے محبت بھری نظروں سے اپنے اس طالب علم کو دیکھا
جوا نہیں بہت عزیز تر تھا۔۔۔۔۔

اب بہت کم ان سے ملنے آتا تھا۔۔۔۔۔

آج بھی ان کی بیماری کا سن کے بھاگا چلا آیا تھا۔۔۔۔۔

صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھے۔۔۔۔۔ اس سفید داڑھی والے بزرگ
نے۔۔۔۔۔ مسکرا کے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔۔۔۔۔
”اٹلی سے کب لوٹے ہو۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے سر سری سا پوچھا
”دو دن پہلے۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکائے طاعذاری سے کہا
تو وہ مسکرا دیئے۔۔۔۔۔

”تم سر اٹھا کے بات کیوں نہیں کرتے ہم سے۔۔۔۔۔؟“

مفتی جمیل الرحمان نے آج اس سے سوال پوچھ ہی لیا

”کیوں کے استاد جی آپ میرے استاد ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے سر اٹھا کے جینا سکھایا

ہے۔۔۔۔۔“ اور جو سر اٹھانا سکھائی یں ان کے سامنے سر نہیں اٹھایا جاتا۔۔۔۔۔“

انہوں نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا
تو انہوں نے رشک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔۔
”آپ کے وسیلے سے میں نے خدا کو پہچانا۔۔۔۔۔ آپ کا میری جان پہ بہت برا احسان ہے
وہ تشکر بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا
اسی لمحے دروازہ کھلا اور نسوانی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی
اس نے سر نہیں اٹھایا۔۔۔۔
”باباجان۔۔۔۔۔ کدھر ہیں آپ۔۔۔۔۔“ باہر گاڑی کس کی کھڑی ہے کوئی آیا ہے
کیا۔۔۔۔۔؟“

کھنک دار آواز اب قریب سے سنائی دے رہی تھی
یکدم وہ خاموش ہوئی

شاید وہ اسے دیکھ چکی تھی۔۔۔۔۔ اس سے پہلے وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی

وہ اکثر یہ آواز سنتا تھا

یہ ان کی بیٹی تھی ماہ جبین۔۔۔۔

اس نے کھنکیوں سے دیکھا۔۔۔۔

دروازے کے پاس ایک برقعہ پوش لڑکی کھڑی تھی اس کی نظریں۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھوں

پہ جم گئی۔۔۔۔۔ جو کالے سیاہ تھے کسی سیاہی کی مانند

اس نے نظر اٹھا کے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھنے کی جسارت کر ہی لی

وہ ایک انیس بیس سال کی دہلی پتلی لڑکی تھی جس نے اپنا آدھا چہرہ نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا

اس کے ماتھے اور آنکھوں کو دیکھ کے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا رنگ سیاہی جیسا

ہے۔۔۔۔

یکدم دونوں کی نظریں ٹکرائی۔۔۔۔

ان نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ اس نے دانستہ نظریں چرا کے سر جھکا لیا۔۔۔۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔

وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

اس کا دل یکدم ہر چیز سے اوچاٹ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

پھر مفتی صاحب کے لاکھ روکنے کے باوجود وہ وہاں سے باہر نکل آیا تھا

اور نکلتے وقت اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ کبھی لوٹ کے یہاں نہیں آئے گا لیکن

قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا



انا کہت ہے محسن روٹھنے والے کو جانے دو

کوئی اندر سے کہتا ہے منالیتے تو اچھا تھا۔۔۔۔۔

جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا تھا اس وقت۔۔۔۔۔ باہر شام کے سائے گہرے ہو چکے
تھے بہت دیر وہ دوائی یوں کے زیر اثر وہ سوتی رہی جیسے ہی وہ جاگی۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اس سے
ملنے کی اجازت دے دی تھی۔۔۔۔۔

وہ اندر آیا تو۔۔۔۔۔ وہ سنبھل کے ٹیک لگا کے بیٹھی تھی ملازمہ اسے سوپ پلا رہی تھی
وہ تیزی سے اس طرف بڑھا اور۔۔۔۔۔ ملازمہ کے ہاتھ سے پیالہ جھپٹ لیا۔۔۔۔۔
اس حرکت پہ وہ بوکھلا گئی۔۔۔۔۔

اس نے باؤل ٹیبل پہ پٹخا۔۔۔۔۔ تو کچھ سوپ جھلک کے وہی ٹیبل پہ گر گیا
زرپاش نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا

وہ جولا تعلق سی بیٹھی تھی اب وہاں اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔
”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

وہ دبے دبے غصے سے بولی۔۔۔۔۔

”انہیں میں نے منع کیا تھا کہ یہ اب تمہارے آس پاس دیکھائی نہ دیں مجھے۔۔۔۔۔“

وہ خشمگین نظروں سے سہمی ہوئی ملازمہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

”آپ نے انہیں کس خوشی میں منع کیا ہے۔۔۔؟“ یہ اپنے ہرے

اس کے لہجے میں طنز کی آمزش اس سے چھپی نہ رہ سکی۔۔

وہ بات کے اختتام پہ اسے بہت کچھ باور کروا گئی۔۔۔۔۔

”یہ اپنے ہیں تمہارے جنہوں نے تمہیں زہر دیا“

اسے سچ مچ اس کی ذہنی حالت پر شک بھی ہوا اور افسوس بھی

”ہاں کیوں کے یہ مجھے کسی کے رحم و کرم پہ چھوڑ کے بھاگ نہیں گئے بلکہ یہاں ہسپتال تک

لائے۔۔۔۔۔ ورنہ میں تو مر چکی ہوتی۔۔۔۔۔

اس نے تیز لہجے میں کہہ کے افسوس سے سر کو جھٹک ڈالا

اور ضبط کر کے دوسری طرف دیکھنے لگی

وہ تھوڑا ٹھنڈا پڑ گیا

”اچھا چلو تیاری کرو تمہیں ساتھ لے کے جاؤں گا میں۔۔۔۔“

وہ ذرا نرمی سے بولا

تو اس نے تڑپ کے اس کی طرف دیکھا

اسے لگا وہ اس پہ رحم کھا رہا ہے۔۔۔۔

”سنا نہیں تم نے۔۔۔۔۔؟“

اس نے اب کی بار ذرا سختی سے کہا

”میں کہیں نہیں جا رہی۔۔۔۔۔“

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دلیری سے کہا۔۔۔۔

اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔۔۔۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“

لہجے میں طنز تھا۔۔۔۔

”بالکل بھی نہیں۔۔۔۔۔ جو انسان بیوی کو کسی اور کے رحم کرم پہ چھوڑ جائے وہ کوئی ی حق نہیں رکھتا۔۔۔۔۔

اس نے اسے آئی نہ دیکھایا
وہ اسے ناگوار نظروں سے گھور کے رہ گیا۔۔۔۔۔



تیر وہ جو مجھ کو لگے وہ بھی عنایت ہیں تیری
تو نے ہمیں سوچا نفرت میں پنہاں ہی سہی

ہسپتال کے اس کشادہ کمرے میں یکدم گھٹن کا احساس بڑھ گیا۔۔۔۔۔ وہاں تھوڑی دیر
خاموشی کا راج قائم رہا۔۔۔۔۔ وہ تیوری چڑھائے۔۔۔۔۔ غصیلی نظروں سے اسے دیکھتا رہا
جو رخ دوسری طرف موڑے۔۔۔۔۔ ناراضگی چہرے پہ سجائے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔

”تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے ایک ابرو اٹھا کے جیسے تائی ید چاہی۔۔۔۔۔

”بالکل۔۔۔۔۔“

وہ پلٹ کے کندھے اچکا کے دو بدو بولی

اسے پتہ نہیں کیا سو جھی۔۔۔۔۔

وہ تیزی سے اس طرف بڑھا۔۔۔۔۔ اس کا وہ ہاتھ پکڑا۔۔۔۔۔ جس کی رگوں میں سوئی

دھنسی ہوئی تھی

اسے سختی سے ہاتھ میں پکڑا۔۔۔۔۔

وہ جو یہ سمجھ کے بیٹھی تھی کہ وہ چلا جائے گا۔۔۔۔۔

اس اچانک افتاد پہ بوکھلا گئی۔۔۔۔۔

ساتھ ہی ہاتھ میں درد کی شدید ٹیس کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔۔۔۔

اس نے ہاتھ سے پکڑ کے اسے زبردستی اٹھایا۔۔۔۔۔

اس کے ہاتھ سے یکدم وہ سوئی ی نکلی۔۔۔۔ اور ڈرپ اتر گئی۔۔۔۔ اسٹینڈ زمین بوس ہوا۔۔۔۔

اور خون کی ایک پتلی لکیر۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ سے بہتی ہوئی می زمین پہ ٹپک گئی وہ سپاٹ چہرہ لیے۔۔۔۔۔ اسے تقریباً کھینچتے ہوئے۔۔۔۔۔ باہر کی طرف لے گیا۔۔۔۔ وہاں موجود لوگ رک رک کے اس منظر کو دیکھ رہے تھے لیکن یہاں پرواہ کسے تھی۔۔۔۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گرفت مضبوط تھی۔۔۔۔

اس نے ہسپتال سے باہر نکل کے ہی دم لیا تھا

اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا

درد کی شدت کی وجہ سے اس کی آنکھیں لال ہو چکی تھیں۔۔۔۔

وہ ملا متی نظروں سے اسے دیکھ کے رہ گئی لیکن وہ سامنے ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ

_____و

”آپ ہوتے کون ہیں۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے۔۔۔۔۔؟“

وہ باہر آ کے پھٹ پڑی

پارکنگ میں گزرتے کچھ لوگوں نے پلٹ کے انہیں دیکھا تھا

”میں تمہارا شوہر۔۔۔۔۔۔“

انداز سراسر۔۔۔۔۔ جتانے والا تھا۔۔۔

”اوہ تو آپ کو یاد آگیا کہ آپ میرے شوہر ہیں۔۔۔۔۔؟“

اب کی بار۔۔۔۔۔۔ لہجے میں طنز کی آمزش تھی۔۔۔

وہ ہاتھ باندھ کے۔۔۔۔ لاپرواہی سے بولا۔۔۔۔

”شوہروں والا کوئی حق نہیں رکھتے آپ۔۔۔۔۔؟“

وہ جیسے اسے وارن کر کے۔۔۔ آگے بڑھنے لگی۔۔۔

اسی لمحے اس نے اسے کہنی سے پکڑا اور اپنے قریب کیا

وہ یکدم سہم گئی۔۔۔۔۔

”میں تمہارا شوہر ہوں اور تم پہ سارے حق رکھتا ہوں۔۔۔۔ اور یہ حق پورے کرنے کی جسارت بھی رکھتا ہوں۔۔۔۔“ اور تم یہ بات ذہن نشین کر لو تو اچھا ہو گا تمہارے لیے۔۔۔۔“

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک ایک لفظ چبا کے بولا تو وہ بس اس کی آنکھوں میں دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔

اسی لمحے اس نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ کھولی۔۔۔۔ اور اسے اندر کی طرف دھکا دیا۔۔۔۔ وہ شدید غصے میں لگ رہا تھا

ایک لمحے میں اس کا طنطنہ ہوا بن کے اڑ گیا اور اس کی جگہ اسی ڈری سہمی لڑکی نے لے لی۔۔۔۔

اس نے بھی ڈرائی یونگ سیٹ سنبھال لی۔۔۔۔

وہ بس اب خاموشی سے ڈرائی یونگ کر رہا تھا۔۔۔۔

اور وہ ہونٹ کچلتے ہوئے گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی

“_____ سنیو”

اس کے پکارنے پر بھی وہ متوجہ نہیں ہوئی۔۔۔۔

”کہیں زہر تم نے خود تو نہیں کھائی تھی۔۔۔۔۔؟“

وہ شکوک و شہبات بھرے لہجے میں بولا۔۔

تو اس نے رخ موڑ کے ایک نظر اسے دیکھا۔۔۔

”اور آپ کے خیال میں میں زہر کیوں کھاؤں گی۔۔۔۔۔؟“

اس نے الٹا سوال پوچھا تھا۔۔۔

”کیوں کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔۔۔۔۔؟“

اس نے ایک نظر اسے دیکھ کے یاد دلایا تھا۔۔۔۔۔

”میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ اتنی سی بات پہ اپنی زندگی ختم کر دوں۔۔۔۔“

اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہہ کے سر سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹکا دیا۔۔۔۔۔

وہ اسے ایک نظر دیکھ کے رہ گیا۔۔۔۔۔

اسے بے ساختہ ہلکی سی شرمندگی کے احساس نے آن گھیرا۔۔۔۔۔

”تم اگر میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے روک کہ کہتی مجھے ساتھ لے کے جائیں تو مجھے اچھا لگتا۔۔۔۔۔“

اس نے نرمی لہجے میں سمو کے اسے احساس دلایا

وہ یکدم چونکی۔۔۔۔۔

”میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

وہ نا سمجھی سے بولی

”کیوں تم ایسا کیوں نہیں کر سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“ آخر کو تم میری بیوی ہو۔۔۔۔۔“ حق ہے

تمہارا۔۔۔۔۔

وہ چڑ گیا تھا۔۔۔۔۔

آپ نے حق دیا ہی کب ہے مجھے۔۔۔۔۔؟

وہ دکھ سے بولی۔۔۔۔۔

”حق دیا نہیں جاتا۔۔۔۔۔ حق خود لیا جاتا ہے۔۔۔۔۔“ ہم ایسے معاشرے کا حصہ ہیں کہ زندگی کے کسی بھی پہلو سے دیکھ لو جب تک دوسرا ذبردستی حق لے نا ہم اسے حق دینے کے حق میں ہی نہیں ہوتے۔۔۔۔۔“

اس نے u ٹرن لیتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھایا

”میں مرد ہوں زرپاش۔۔۔۔۔ عورت کی نسبت انا پرست ہوں۔۔۔۔۔ میں اپنے احساسات چھپانے میں بھی ماہر ہوں میں عورت کی طرح وفا کا پرستار نہیں ہوں۔۔۔۔۔ میں عورت جیسی برداشت اور حوصلہ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ میں شراکت معاف نہیں کرتا۔۔۔۔۔ میں خود

ایک پہ اکتفا کروں یا نہ کروں تم سے یہی امید رکھتا ہوں کہ تم۔۔۔۔۔ شراکت نہ کرو۔۔۔۔۔“

اس نے توجہ سے گاڑی چلاتے ہوئے اسے رساں سے سمجھایا۔۔۔۔۔

وہ دم سادھے اسے سن رہی تھی۔۔۔۔۔

میں تخلیق ہی ایسے کیا گیا ہوں۔۔۔۔۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔۔۔۔۔“ لیکن

عورت۔۔۔۔۔ تو پھر عورت ہے۔۔۔۔۔ اس کو خدا نے خود ہی مرد سے تھوڑا۔۔۔۔۔ نیچے

رکھا ہے تاکہ وہ برابری نہ کر بیٹھے۔۔۔۔۔ میں مانتا ہوں وہ بھی انا پرست ہوتی ہے لیکن اس

کی زندگی میں ایک ایسا مرد ضرور آتا ہے جس کے لیے وہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھ دیتی

ہے۔۔۔۔۔ اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیئے۔۔۔۔۔“

تم کل کی بات میں صرف مجھے بلیم نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔“

اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔۔

”اگر میں تمہیں چھوڑ کے جاہی رہا تھا تو تمہیں چاہیئے تھا کہ۔۔۔۔۔ تم میرا راستہ روک لیتی
۔۔۔۔۔ میرا ہاتھ پکڑتی۔۔۔۔۔ میرے ساتھ چلتی۔۔۔۔۔ مجھ سے پہلے گاڑی میں بیٹھتی
۔۔۔۔۔ ”کیونکہ تم یہ حق رکھتی ہو۔۔۔۔۔“ اگر تم اپنے ہونے کا احساس ہی نہیں دلاؤ گی تو
میں خاک تمہیں یاد رکھوں گا۔۔۔۔۔“؟
اس نے مڑ کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا
وہ بس منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی
وہ شخص گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔۔۔۔۔
”میں نے بھی تو آج اپنا حق استعمال کیا ہے۔۔۔۔۔“ یہ حق تم بھی استعمال کر سکتی تھی۔۔۔۔۔
اس نے اسے جیسے اکسایا۔۔۔۔۔
”ہم لوگوں کا یہی مسئی لہ ہے۔۔۔۔۔ حق استعمال نہیں کرتے بعد میں قسمت کو روتے
ہیں۔۔۔۔۔“

وہ طنز یہ ہنسا۔۔۔۔۔

”خیر میں یہ کرنا نہیں چاہتا تھا“

اس نے اسٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کہ جیسے۔۔۔۔۔ سیرنڈر کیا تھا۔۔۔۔۔

اگر تم میری بات من لیتی تو میں ایسی حرکت نہ کرتا۔۔۔۔۔ لیکن میں اب تم پہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔۔۔۔۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔۔۔۔۔

”اور آپ میری جان پہ رسک کیوں نہیں لینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔؟“

وہ دلچسپی سے بولی۔۔۔۔۔

”ایک منٹ۔۔۔۔۔“

اس نے سنجیدگی سے جیب میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کے اس کی طرف بڑھایا

جسے اس نے تھام لیا

”کیونکہ اس کے مطابق۔۔۔۔۔ اب میں تمہارا شوہر ہوں اور تم میری ذمہ داری ہو۔۔۔۔۔“

اس نے مزے سے کہا

تو وہ ہنسی ضبط کر گئی۔۔۔۔۔

وہ نکاح نامہ تھا وہ بغیر کھولے بھی یقین سے کہہ سکتی تھی۔۔۔۔۔

اسے نہیں پتہ تھا وہ اسے کہاں لے کے جا رہا ہے۔۔۔۔۔

لیکن اسے اتنا پتہ تھا کہ اب وہ محفوظ ہے۔۔۔۔۔

وہ ایک دفعہ پھر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔۔۔۔۔



ایک نظر ادھر دیکھ تماشہ ہی سہی

تیرا پردہ تیری دوری حالات کا تقاضہ ہی سہی۔۔۔۔۔

دسمبر کی اس ٹھٹھرتی۔۔۔۔۔رات میں جب ہر طرف سناٹا تھا ان کا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا
تھا۔۔۔۔۔جب اس کے موبائی ل کی رنگ ٹون نے اس خاموشی کو توڑا۔۔۔۔۔
وہ یکدم بوکھلا کے اٹھ بیٹھا۔۔۔۔۔سائیڈ لیپ جلایا۔۔۔۔۔آنکھیں مل کے دیکھ رات کے دو
نچ رہے تھے۔۔۔۔۔
دل میں خیریت کی دعا کرتے ہوئے اس نے موبائی ل فون۔۔۔۔۔اٹھایا۔۔۔۔۔سامنے چمکتے
نمبر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ چونکا۔۔۔۔۔
دوسرے لمحے اس نے کال اٹھا کہ فون کان کے ساتھ لگایا۔۔۔۔۔
دوسری طرف اس کی سماعتوں کے ساتھ وہی کھنک دار آواز ٹکرائی
وہ شاید رو رہی تھی۔۔۔۔۔
”آپ رو کیوں رہی ہیں؟“
وہ مفتی صاحب کے نمبر سے اس کی آواز سن کے پہلے ہی تشویش کا شکار ہو چکا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ پلیز یہاں آجائیں باباجان کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔۔۔۔“

وہ روتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے۔۔۔۔۔ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ کال کاٹی اور۔۔۔۔۔ ٹیبل سے

چابی اٹھا کے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔۔۔۔۔ وہ اس وقت مری کے ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا

تھا

اس وقت وہ سادہ سی ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھا۔۔۔۔۔ تیزی میں وہ جیکٹ پہن کے باہر نکل

آیا تھا

باہر نکلتے ہی بخ بستہ ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔۔۔۔۔

وہ ہوائیوں میں اس کو اپنی روح میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔۔۔۔۔

اسے محسوس ہوا۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ جم گئے ہیں وہ اب ڈرائیونگ نہیں کر پائے گا

اضطرابی کیفیت میں دنوں ہاتھوں کا آپس میں رگڑا۔۔۔۔۔

اور گاڑی سٹارٹ کی۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس چھوٹے سے گھر کے باہر کھڑا تھا۔۔۔۔۔

”دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔۔۔“

تو وہ جلدی سے کھول دیا گیا

وہ سامنے موجود لڑکی پر ایک بھی نگاہ ڈالے بغیر اندر کی طرف بڑھ گیا

جہاں صوفیہ وہ نیم دراز لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔۔۔۔۔

”آتے ہوئے۔۔۔۔۔ اس نے ڈاکٹر کو کال کر دی تھی جو اس کا بہت اچھا دوست تھا

لیکن ان کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی

اس نے آگے بڑھ کے۔۔۔۔۔ ان کا سر اپنی گود میں رکھا

وہ بامشکل کچھ بولنے کی کوشش کر رہے تھے

انہوں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا

اس نے محسوس کیا ان کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو چکا ہے

اب کی بار پہلی بار اس نے ایک سہمی ہوئی نگاہ سامنے کھڑی لڑکی پر ڈالی۔۔۔۔
اس کے چہرے سے اسے خوف آیا۔۔۔۔۔ سیاہ رنگ۔۔۔۔۔ بڑی بڑی گہری آنکھیں
چھوٹی سی ناک۔۔۔۔۔ موٹے موٹے سیاہی مائل ہونٹ۔۔۔۔۔ چہرے پہ عجیب سے نشان
تھے۔۔۔۔۔ اس وقت اس کے چہرے پہ دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔۔۔۔۔
اس نے بی ساختہ نظریں چرائی۔۔۔۔۔
تم میری بیٹی سے۔۔۔۔۔ شا۔۔۔۔۔ دی دی ک۔۔۔۔۔ رلینا۔۔۔۔۔
یہ جملہ گویا کسی بم کی طرح ان کی سماعتوں پر گرا۔۔۔۔۔
سامنے کھڑی لڑکی نے بھی بے یقینی سے اسے۔۔۔۔۔ دیکھا
یکدم ان کا وجود۔۔۔۔۔ ساکت ہوا۔۔۔۔۔
سانسوں کی ڈور شاید ٹوٹ چکی تھی

وہ صدمے کی کیفیت میں بیٹھے رہے اس جملے کی گونج اب بھی انہیں اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی

سامنے کھڑی لڑکی۔۔۔۔۔ بے یقین تھی

اچانک وہ کچھ سوچ کے آگے بڑھی اور اپنے باپ کے بازو کے ساتھ لگ کے رونے لگی۔۔۔۔۔

اس کے رونے کی آواز سے وہ ہوش میں آیا۔۔۔۔۔

اور ان کا سر دھیرے سے بیڈ پہ رکھا۔۔۔۔۔

ان کا بے جان وجود دیکھ کہ اسے تکلیف ہوئی

لیکن ہمت کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا

اسی لمحے دروازہ کھول کے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر شارق اندر داخل ہوا۔۔۔۔۔

ایک نظر بیڈ پہ پڑے بے سدھ وجود کو دیکھا

اور ساری صورت حال سمجھ گیا

اس نے آگے بڑھ کے اس کا کندھا تھپتھپایا۔۔۔

اور وہ اس کے گلے لگ گیا۔۔۔۔

ڈاکٹر شارق کو اس نے جنازے کے انتظامات کا کہا تو وہ گھر سے باہر نکل گیا

اس نے گردن گھما کر وقت دیکھا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔۔۔۔

وہ لڑکی ابھی تک رو رہی تھی۔۔۔۔

”آپ کچھ دیر اگر یہاں اکیلی رہ سکتی ہیں تو۔۔۔۔ میں کفن دفن کے انتظامات دیکھ لو ویسے

بھی میرا اس وقت۔۔۔۔ یوں اس گھر میں موجود ہونا ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔“

وہ پہلی بار نظریں چرا کے متوجہ ہوا تھا۔۔۔

”آپ جائی می میں رہ سکتی ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے روتے ہوئے ہی جواب دی دیا تھا تو وہ محض سر ہلا کے گھر سے باہر نکل گیا

اس نے نم آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔۔۔۔۔ اور ایک دفعہ پھر تڑپ تڑپ کے رو

دی-----



نظر بھر دیکھ لینے سے بھلا کیا ہوگا

ہاں تم معصوم سہی ہم رسوا ہی سہی

جس وقت وہ پتھریلی سڑکوں پہ گاڑی چلا رہا تھا اس لمحے وہ سیٹ کے ساتھ سر ٹکا کے اونگھ رہی تھی وہ سات گھنٹوں سے مسلسل سفر میں تھے۔۔۔۔۔ اب اس کے اعصاب شدید تھکن کا شکار

ہو چکے تھے ایسی ہی کچھ حالت۔۔۔۔۔ زرباش کی بھی تھی۔۔۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ گٹر بڑا کے اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔

”نیند پوری ہوگئی تمہاری۔۔۔۔۔“

وہ عام لہجے میں پوچھ رہا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں وہ تو میں بس ایسے ہی۔۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکا کے خفت بھرے لہجے میں کہا

”نہیں تو بی بی سو جانے پہ شرمندگی کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔؟“

اس نے گاڑی کا دروازے کھولتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ جل کے کہا

تو وہ خاموش رہی۔۔۔۔۔۔

”چلو باہر آؤ۔۔۔۔۔۔“

اسے کہہ کے وہ آگے بڑھ گیا

دروازہ کھول کے وہ باہر نکلی تو ٹھنڈی ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔۔۔۔۔۔

اس نے پہلی بار سر اٹھا کے اس خوبصورت وادی کو دیکھا تھا

خوبصورت پہاڑوں کے حصار میں مقید وہ ایک خوبصورت۔۔۔۔۔۔ فارم ہاؤس تھا جو

خوبصورت رنگ برنگے پتھروں سے بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ ایک طرف کشادہ سڑک تھی سامنے

ہی چھوٹا سا گیٹ تھا اندر ایک طرف چھوٹا سالان تھا جس میں خوبصورت پھول کھلے ہوئے
تھے۔۔۔۔۔ فارم ہاؤس ذرا اونچائی پر تھا۔۔۔۔۔ تو سامنے تنگ سڑک دیکھائی دیتی
تھی۔۔۔۔۔

وہ وہاج کی پیروی میں چلنے لگی۔۔۔۔۔

ملازموں کی ایک فوج۔۔۔۔۔ فوراً سے حاضر ہوئی تھی۔۔۔۔۔

وہ کسی ملازم کو گاڑی پارک کرنے کا کہہ کے اندر بڑھ گیا۔۔۔

زرپاش بھی اس کے پیچھے چلنے لگی۔۔۔۔۔

لکڑی کا بھاری بھر کم دروازہ کھول کے وہ جب اندر داخل ہوئی تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ
گیا۔۔۔۔۔

اس سے قیمتی اور خوبصورت لکڑی کا سامان اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا

سامنے چھوٹا سا ہال نما۔۔۔۔۔ ٹی وی لاؤنچ تھا۔۔۔۔۔ دیوار کے ساتھ لگی ایل سی
ڈی۔۔۔۔۔ لکڑی کے خوبصورت صوفے درمیان میں پڑی خوبصورت ٹیبل۔۔۔۔۔ ہر چیز
خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔۔۔۔۔ دائیں طرف چھوٹا سا اوپن کچن تھا۔۔۔۔۔ اور
ہال سے ہی لکڑی کی سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھی۔۔۔۔۔
وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ کے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبائے لگا۔۔۔۔۔
اسے ابھی تک یوں ہی کھڑا دیکھ کہ وہ چڑ گیا۔۔۔۔۔
”محترمہ اگر آپ کا معافی نہ ختم ہو گیا ہو تو آپ بیٹھ سکتی ہیں۔۔۔۔۔“
اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔۔۔۔۔
تو وہ فوراً صوفے پہ ٹک گئی۔۔۔۔۔
اسی لمحے ایک بوڑھی عورت۔۔۔۔۔ کچن سے چائے کے دو کپ لے کے۔۔۔۔۔ باہر
نکلی۔۔۔۔۔

اور ایک شفقت بھری مسکراہٹ سے چائے ٹیبل پر رکھ کہ وہاں کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

پھر ایک نظر سامنے بیٹھی سبز رنگ کے لباس میں ملبوس خوبصورت سی لڑکی کو دیکھا جو سر پہ

دوپٹہ ٹکائے۔۔۔۔۔ سر جھکائے بیٹھی تھی

اس کے شفاف چہرے پہ بلا کی معصومیت تھی۔۔۔

انہوں نے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔

”وہاں بیٹا۔۔۔ آپ آنے سے ذرا دیر پہلے اگر اطلاع کر دیتے تو۔۔۔۔۔ میں چائے کا ساتھ

اور بھی انتظامات کر دیتی۔۔۔۔۔“

انہوں نے۔۔۔۔۔ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”کوئی بات نہیں بوا۔۔۔۔۔ ابھی ہم یہی ہیں آپ کر لیجیئے گا خدمت۔۔۔۔۔“

وہ کھلے دل سے مسکرایا۔۔۔۔۔

”یہ کون ہے بیٹا۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھ کہ پوچھا۔۔۔۔

”یہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔“

اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سر سرے بتایا۔۔۔۔

تو بوا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔۔۔۔۔

”شادی کر لی آپ نے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔۔۔۔۔

”کیوں بوا۔۔۔۔۔ میں پہلا مرد ہوں جس نے شادی کرنے کا جرم کیا ہے۔۔۔۔۔“

وہ برامانتے ہوئے تیوری چڑھا کے بولا۔۔۔۔۔

”نہیں صاحب جی وہ تو میں ایسے ہی۔۔۔۔۔“

وہ گڑبڑا کہ بولی۔۔۔۔۔

”اچھا بوا۔۔۔۔۔ آپ ملازم سے کہہ کے ہمارا کمرہ سیٹ کروادیں ہلکی پھلکی سجاوٹ بھی کروا دیں۔۔۔۔۔“

ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔۔۔۔۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ ذو معنی انداز میں مسکرایا تو اس کا سر مزید جھک گیا۔۔۔۔۔

بوا سر ہلا کے وہاں سے چلی گئی۔۔۔۔۔

تو وہ بھی چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔۔۔۔۔

البتہ زرباش کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔۔۔۔۔



وہ میرے درد سے اکثر انجان بنا رہتا ہے

وہ میرا محسن ہی سہی درد شناس ہی سہی

جس وقت وہ۔۔۔۔۔ سڑھیاں چڑھ کے ڈرتی ہوئی دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ رات کے سائے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔۔۔۔۔

سوات کی اس خوبصورت وادی میں رات عجیب سحر انگیز تھی۔۔۔۔

راولپنڈی کی نسبت۔۔۔۔۔ یہاں موسم کافی ٹھنڈا تھا۔۔۔۔۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا گلاب کے پھولوں کی محسوس کن خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لیا۔۔۔۔۔

اندر مدہم روشنی تھی۔۔۔۔

سامنے بڑی سی کھڑکی کے باہر۔۔۔۔۔ سوات کی خوبصورت وادی صاف دیکھائی دے رہی تھی

گھروں میں جلتی بتیاں کسی جگنو کی طرح دیکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔

اس نے نظر گھما کے دیکھا وہ بیڈ پہ نیم دراز تھا۔۔۔۔۔
بازو آنکھوں پہ رکھے شاید وہ سوچکا تھا۔۔۔۔۔
وہ بھی اپنے سونے کے لیے جگاڈھونڈنی لگی۔۔۔۔۔
”ہاں تو محترمہ زرباش۔۔۔۔۔ کیا کہا تھا آپ نے مجھے۔۔۔۔۔“ کہ۔۔۔۔۔ رقص نہیں
کرتی میں کوٹھے میں رہ کے طوائف نہیں ہوں۔۔۔۔۔“
اس کے الفاظ اس کی سماعتوں کے ساتھ ٹکرائے تو اس کے بڑھتے قدم۔۔۔۔۔ ٹھہر
گئے۔۔۔۔۔
وہ مڑی نہیں لیکن ایک لمحے کے لیے اس کی سانس رک گئی۔۔۔۔۔
وہ جاگ رہا تھا۔۔۔۔۔
”لیکن دیکھو اس سب کے باوجود جو میں نے چاہا میں نے کر لیا اس کا واضح ثبوت۔۔۔۔۔ یہ ہے
کہ تم اس وقت میرے کمرے میں میرے ساتھ موجود ہو۔۔۔۔۔“

اس نے جتاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”اب کی بار وہ پلٹی تھی۔۔۔۔۔

”کیوں کہ اب بیوی ہوں میں آپ کی۔۔۔۔۔“

وہ بھی بہت کچھ جتاگئی تھی

وہ بھی کھکھلا کے ہنسا تھا۔۔۔۔۔

”اچھا شکر ہے تم یہ تو مانی۔۔۔۔۔“

اس نے مصنوعی۔۔۔۔۔ معصومیت سے کہا۔۔۔۔۔

”تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔۔۔ یہاں ادھر بیٹھو۔۔۔۔۔ کسی غیر کے ساتھ نہیں ہو شوہر

ہوں تمہارا۔۔۔۔۔“

وہ سنجیدگی سے بولا۔۔۔۔۔

تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

”ہاں تو۔۔۔۔۔ پھر میں جیت گیا۔۔۔۔۔“

وہ سیدھا ہو کے اٹھ بیٹھا وہ اسے تپانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔

اب تو میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کا حق رکھتا ہوں نا۔۔۔۔۔

وہ شرارتی لہجے میں بولا۔۔۔۔۔

وہ چپ رہی۔۔۔۔۔

”دیکھو جب تک تم میرے ساتھ ہو تب تک تو تم میری بیوی ہو۔۔۔۔۔ تو اس لحاظ سے میرا

ہر کام کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔۔۔“

وہ اسے سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔۔۔۔۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ جب تک میں ساتھ ہوں۔۔۔۔۔؟“

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر نا سمجھی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”ہاں تو تمہیں کیا لگتا تمہیں پوری عمر کے لیے گلے میں لٹکانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔۔۔۔۔؟“

وہ لا پرواہی سے بولا

تو اس کے سینے پہ خنجر چلنے لگے۔۔۔۔۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔“ آپ نے مجھ سے شادی کس لیے کی تھی۔۔۔۔۔“

وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی

”حقوق جائز طریقے سے حاصل کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ کیوں کہ ایسے تم کوئی بھی حق

نہیں دینا چاہتی تھی

وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کے۔۔۔۔۔ بولا

تو اس کے گلے میں نمکین سا گولا پھنس گیا۔۔۔۔۔

اور اب میں ہی یہ فیصلہ کروں گا کہ۔۔۔۔۔ تمہیں کب تک ساتھ رکھنا ہے۔۔۔۔۔

اب کی بار بھی لا پرواہی سے کہا گیا تھا۔۔۔۔۔

اپنی ذات کو یوں بے وقعت دیکھنا اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا

لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔۔۔۔۔

”تم نے ہی کہا تھا میں گھٹیا ہوں نکاح کے لفظ کا غلط استعمال کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“ تو گھٹیا لوگ

میرے جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا کہ اسے یاد دہانی کروا رہا تھا

”اور ہاں میں بہت تھک گیا ہوں ذرا ٹانگیں دبا دو میری میں بہت تھک گیا ہوں۔۔۔۔۔“

اگلا حکم صادر کیا گیا تھا۔۔۔۔۔

وہ ضبط کے مارے لال آنکھوں سے اسے دیکھ کے رہ گئی

جو رخ موڑ کے سونے کو تیار تھا

وہ چپ چاپ اس کی ٹانگیں دبائے لگی

اسے نہیں معلوم تھا قسمت اب اسے کس دور پہ پر لے جائے گی۔۔۔۔۔



وہ انا پرست تھا اسکی باتوں میں اقرار بھی تھا
اسکے چھتے ہوئے لہجے میں پیار بھی تھا۔۔۔۔۔

نومبر کی پل پل بدلتی صورت حال کے مطابق سوات کی ہوائیں بھی رنگ بدل رہی
تھی۔۔۔۔۔ کبھی ہلکی ہلکی دھوپ نکل آتی کبھی آسمان پہ کالے بدل چھا جاتے۔۔۔۔۔ موسم
خزاں کے اوائل دنوں میں۔۔۔۔۔ سبز پتے بدل کے ہلکے زرد دیکھائی دے رہے
تھے۔۔۔۔۔ اور اونچی قد آور درختوں سے جھڑتے۔۔۔۔۔ یہ زرد پتے زمین پہ بچھی سبز چادر پہ
گرتے تو عجیب سحر انگیز نظارہ پیش کرتے۔۔۔۔۔
اپنے کمرے کی گلاس ونڈو کے باہر نظریں جمائے وہ کھڑی تھی
جہاں سبزے پہ خوبصورت گھوڑے۔۔۔۔۔ گھاس کھانے میں مصروف تھے
ہاتھ میں پکڑا کافی کاکپ ٹھنڈہ پڑچکا تھا
لیکن وہ اپنی ہی سوچوں میں گری کھڑی تھی۔۔۔۔۔

جب دروازہ دھیرے سے کھول سے وہ اندر داخل ہوا۔۔۔۔
اسے ایک نظر دیکھا جس نے اس کی موجودگی کانوٹس بھی نہیں لیا تھا
وہ اسے طرح ہی نظریں باہر جمائے کھڑی تھی
وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آیا
اور ہاتھ باندھ کے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا
اور اس کے کان کے قریب جا کے گلا کھنکارا۔۔۔۔ تو وہ یکدم چونک کے پیچھے مڑی۔۔۔۔
تو اس کے سینے کے ساتھ جا ٹکرائی
پھر یکدم لرزتی پلکیں اٹھا کے۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔۔
وہ مسکرا رہا تھا
وہ بالکل اس کے قریب کھڑا تھا
وہ تھوڑی سی شرمندہ ہو کے پیچھے ہٹنے لگی۔۔۔۔

تو اس نے ہاتھ ونڈا سکرین کے ساتھ ٹکا کے اسے یہ کرنے سے باز رکھا
وہ اب اس کے بازؤں کی گرفت میں سر جھکائے کھڑی تھی۔۔۔۔
”اب مارو میرے منہ پہ تھپڑ۔۔۔۔۔؟“

وہ مصنوعی غصہ چہرے پہ سجائے اسے اکسار ہاتھ
وہ سانس روکی خاموشی سے وہی کھڑی رہی۔۔۔۔
”مارو۔۔۔۔۔؟“

وہ دوبارہ حاکمانہ لہجے میں بولا
تو اس نے بامشکل سراٹھایا۔۔۔۔
اور لب کچلنے لگی۔۔۔۔
”میں نہیں مارونگی۔۔۔۔۔“

اس نے جان چھڑانی چاہی۔۔۔۔۔“

کیوں بھلا۔۔۔۔؟

وہ انجان بنا۔۔۔۔

”کیونکہ اب آپ میرے شوہر ہیں۔۔۔۔۔“

وہ آہستہ آواز میں ہچکچاتے ہوئے۔۔۔۔۔ بولی

تو وہ کھکھلا کے ہنسا۔۔۔۔۔

اس نے گھبرا کے نظریں جھکالی۔۔۔۔

”دیکھو تمہارے منہ سے مجھے شوہر کہنا۔۔۔۔۔ مجھے بہت پسند ہے۔۔۔۔۔“

اس نے تھوڑی سے پکڑ کے اس کا چہرہ۔۔۔۔۔ اوپر کیا۔۔۔۔۔

وہ ذومعنی انداز میں مسکرا رہا تھا

”ہٹیں مجھے تھوڑا کام ہے۔۔۔۔۔“

وہ جانے کے لیے پر تو لنے لگی۔۔۔۔۔

”کیا مجھ سے بھی کوئی ضروری کوئی کام ہونا چاہیئے تمہاری زندگی میں۔۔۔۔؟“

وہ مصنوعی ناراضگی سے بول کے اسے پھر لا جواب کر گیا۔۔۔۔۔

”پہلی عورت دیکھی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ بھی خود کو اتنا غیر محفوظ سمجھتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کے۔۔۔۔۔ جی بھر کے بد مزہ ہوا۔۔۔۔۔

بیویاں رو مینس سے خوش ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اور تم گھبرا جاتی ہو۔۔۔۔۔“

اسے اب اس کی خاموشی سے کوفت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔

”وہ اصلی بیویاں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔“

اس کی بھی برداشت اتنی ہی تھی

اس لیے جل کر بولی

اس کے لبوں پہ تبسم بکھر گیا

”تو کیا تم نقلی بیوی ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے اسے چھیڑا۔۔۔۔

”ہاں آپ کی نظر میں ایک فالتو چیز جسے آپ جب تک چاہیں۔۔۔۔۔ گے ساتھ رکھیں گے اور

جب چاہیں گے چھوڑ دیں گے۔۔۔۔۔“

وہ اس کو بہت کچھ جتاگئی تھی

”تو کیا تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک ابرو اٹھا کے بولا۔۔۔۔۔

وہ فوراً بوکھلا گئی جذبات میں وہ شکوہ کر بیٹھی تھی

”مجھے نہیں پتہ۔۔۔۔۔

جان چھڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے

وہ اس کے بازو کے نیچے سے ہو کے نکل گئی۔۔۔۔

اس حرکت پہ وہ مسکرا دیا

پھر یکدم اس کے پیچھے آیا

جو اپنی حفت مٹانے کے لیے یو نہی بیڈ کی چادر درست کرنے لگی

اس نے ایک نظر ناگواری سے اس کے سر آپے کو گھورا۔۔۔

جو اس وقت ہلکے آسمانی رنگ کی لمبی قمیض اور چوڑی دار اور پاجامہ پہنے ہوئے تھی

ہلکے گولڈن رنگ کے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑہ بنا رکھا تھا۔۔۔۔

سنو۔۔۔۔

اس کے پکارنے پہ بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی

وہ اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز پاتا تھی۔۔۔

”مانا میں تمہیں پسند نہیں ہوں۔۔۔۔ لیکن اب ایسی بھی کیا ناراضگی ہے کہ۔۔۔۔ تم نے ایسا

بیوہ عورتوں والا حلیہ بنا لیا ہے۔۔۔۔“

وہ برا سامنہ بنا کر بولا

تو اس نے پلٹ کے اسے گھورا تھا۔۔۔۔

خود کو بیوہ کہنا اسے برا لگا تھا

لیکن اس کا اظہار نہ کر پائی

اور واقعی آج صبح ہی میک اپ کا تمام سامان بوانے ڈریسنگ ٹیبل پہ سجا دیا تھا

وہ الگ بات تھی کہ اس نے پلٹ کے اس طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔۔۔

وہ دھیرے سے اٹھا۔۔

اور اس کے قریب آیا اسے بازو سے پکڑ کے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے لے گیا

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ کے رہ گیا۔۔۔۔

ٹیبل پہ پڑی مختلف شیڈز کی لپ اسٹکس میں سے ایک ڈارک شیڈ لگایا

اور اس کے ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگانے لگا۔۔۔

وہ بس حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔

ساتھ ہی اس کے بالوں پہ۔۔۔۔۔ لگا کیچر کھولا۔۔۔۔۔
لبے بال شانوں سے ہوتے ہوئے کمر پہ بکھر گئے۔۔۔۔۔
وہ اپنا اور اس کا عکس شیشے میں دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔۔
”اب لگ رہی ہونا تم تھوڑی تھوڑی دلہن۔۔۔۔۔“
وہ فاتحانہ لہجے میں بولا۔۔۔۔۔
ساتھ ہی بوا کو آوازیں دینے لگا۔۔۔۔۔
بوا تیزی سے ادھر آئی۔۔۔
بوا جو کپڑوں کا آرڈر دیا تھا وہ تیار ہوا کہ نہیں۔۔۔؟
وہ صوفی پہ بیٹھ کے اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔۔۔
”جی صاحب جی تھوڑی دیر تک۔۔۔۔۔ ہو جائیں گے تیار۔۔۔۔۔“
بوانے ایک نظر سر جھکا کے کھڑی زرباش کو دیکھ کے اطلاع دی۔۔۔۔۔

”اچھا صحیح۔۔۔۔۔ تب تک آپ کسی مہندی لگانے والی لڑکی کا انتظام کریں۔۔۔۔۔“

اس نے پر سوچ نظروں سے سر جھکا کے کھڑی زرباش کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

تو بوا سر ہلا کے وہاں سے چلی گئی۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک لڑکی کے ساتھ وہاں موجود تھی

وہ چودہ پندرہ سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔۔۔۔۔ پٹھانوں کا مخصوص لباس پہنے وہ خدو

خال سے یہاں کی رہائی شی لگتی تھی۔۔۔

زرباش تو بس کسی کٹھ پتلی کی طرح اس کے کہنے پہ عمل کرتی جا رہی تھی

ابھی بھی اس کے کہنے پہ مہندی لگو رہی تھی۔۔۔۔۔

وہ پاس بیٹھا تنقیدی نظروں سے جائی زہ لے رہا تھا۔۔۔۔۔

پھر ایک نظر اس کے سفید ہاتھوں پہ لگی مہندی پہ ڈالی۔۔۔۔۔

”سنو یہاں جگہ چھوڑ دو یہاں میرا نام لکھنا۔۔۔۔۔“

اس کے یوں کہنے پہ وہ فوراً چونکی۔۔۔۔

لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔۔۔۔

”سنو۔۔۔۔۔“

یہ لباس کدھر سے لیا ہے تم نے۔۔۔۔“

اس کے مخصوص موتیوں والے لباس کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔۔۔۔

”یہ اماری اماں نے خود بنایا ہے لالا۔۔۔۔“

اس نے مہندی لگاتے ہوئے اردو میں کہنے کی کوشش کی۔۔۔۔

ایک میری بیوی کے ناپ کا بھی بنا دو۔۔۔۔۔“

اس کے اگلے حکم پہ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔۔۔۔

وہ اس کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

پتہ نہیں وہ کرنا کیا چاہتا تھا۔۔۔۔

”ہاں بنوادوں گی لالا۔۔۔۔۔“

اس نے فوراً کہا۔۔۔۔۔

وہ جلدی بے تکلف ہونے والی لڑکی تھی۔۔۔۔۔

”میری بیوی ہے بھی پیاری۔۔۔۔۔“ اس کے ساتھ تو بہت خوبصورت لگے گا۔۔۔۔۔“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔

تو اس نے سر مزید جھکا لیا

پتہ نہیں وہ بار بار اس پہ کیا جتنا چاہتا تھا

”لالا بہت محبت کرتا ہے تم سے۔۔۔۔۔“

لڑکی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

اس نے چور نظروں سے دیکھا تو وہ ایسے بیٹھا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نا ہو۔۔۔۔۔

دل کے اندر کہیں ٹیس اٹھی تھی۔۔۔۔۔

وہ اس کی طرف دیکھ کے زبردستی مسکرا دی۔۔۔۔
اب وہ اس کے ہاتھ پہ اس کا نام لکھ رہی تھی
اور اس کی نظریں اس نام پہ جم سی گئی
پتہ نہیں یہ نام اس کے نصیب میں تھا یا نہیں۔۔۔۔۔



ہم نے اس کے درد سے اپنی سانس کا رشتہ جوڑ لیا
ورنہ شہر میں زندہ رہنے کی ایک صورت اور بھی ہے
موسم نے پھر اپنا رنگ ڈھنگ بدلا تھا۔۔۔۔ اور بر فباری ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی
تھی۔۔۔۔ کاروبارِ زندگی معطل ہو کے رہ گئی تھی لینڈ سلائی یڈنگ کا خطرہ بھی بڑھ گیا
تھا۔۔۔۔۔ ملکہ کو ہسار پہ سیاخوں کی آمد کی وجہ سے۔۔۔۔۔ ٹریفک جام ہو چکی تھی۔۔۔۔
ایسے میں وہ اس چھوٹے سے گھر کے گرم کمرے میں بیٹھا تھا پاس ہی آگ جل رہی تھی

اس کے ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔۔۔۔۔

آج مفتی صاحب کی تدفین کو چوتھا روز گزر چکا تھا۔۔۔۔۔ مسلسل خود سے جنگ لڑنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچا تھا کہ وہ ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔۔۔۔۔

اور آخر آج شام اس نے ماہ جبین سے خاموشی سے نکاح کر لیا تھا

سب لوگوں کے جانے کے بعد بھی وہ اسی گھر میں موجود تھا

اس وقت وہ دونوں ہی اس کمرے میں موجود تھے

دونوں یوں سر جھکا کے بیٹھے تھے جیسے انہوں نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو

اس خاموشی کو اس کی آواز نے توڑا تھا

”آپ کے ابو کا مجھ پہ بہت بڑا احسان تھا۔۔۔۔۔ کہ انہوں نے مجھ جیسے ایک شرابی انسان کو ہدایت کا راستہ دیکھایا۔۔“

وہ نظریں جھکائے سپاٹ لہجے میں کہہ رہا تھا

اور ان کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔۔۔۔۔ ان کے حکم کے مطابق۔۔۔۔۔ میں نے آپ سے نکاح کر لیا۔۔۔۔۔

لیکن ایک بات آپ یاد رکھی گئے گا۔۔۔۔۔

میری زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔۔۔۔۔

وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا اور وہ سر جھکا کے سنتی پتہ نہیں ضبط کے کون سے مراحل سے گزر رہی تھی۔۔۔۔۔

لیکن ہمارا رشتہ کبھی نکاح سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔۔۔۔۔

”میری بیوی ہے جس سے میں بہت محبت کرتا ہوں میری دو بیٹیاں ہیں۔۔۔۔۔“

اس انکشاف نے تو جیسے۔۔۔۔۔ اس کو اندر تک جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا

اس نے تڑپ کے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا تھا

جو زمین کو گھور رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ کہیں سے بھی شادی شدہ نہیں لگتا تھا۔۔۔۔۔
اور وہ جو یہ سوچ کے بیٹھی تھی کہ وہ اس شخص کی زندگی میں جگہ بنا ہی لے گی۔۔۔۔۔ یہ امید
بھی اپنی موت آپ ہی مر گئی تھی۔۔۔۔۔
اور پھر فقط وہ اتنا ہی بول پائی ہی تھی
”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ نے ابا کا حکم مان کے مجھے۔۔۔۔۔ سہارا دے
دیا۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے۔۔۔۔۔
بات کے آخر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز لڑکھڑاگئی تھی۔۔۔۔۔
ساتھ ہی وہ چائے کا خالی کپ اٹھا کے اٹھ کھڑی ہوئی
وہ اپنے آنسو ان سے چھپانا چاہتی تھی
وہ ملا بھی تو اس تھا تو اس طرح
کہ اس کے دل میں کوئی ہی اور تھا۔۔۔۔۔

اسی لمحے موبائی ل کی اسکرین پہ جلتے بجھتے۔۔۔۔۔ مہر النساءؑ کے نام نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔۔۔۔۔

انہوں نے بجھے دل کے ساتھ فون اٹھایا۔۔۔۔۔

فون اٹھاتے ہی وہ شروع ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ اس چیز سے بے خبر کے ان کا شوہر اب بٹ چکا ہے۔۔۔۔۔

وہ بس ہاں ہوں میں جواب دے رہا تھا

کچن میں کھڑی وہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی

اور باہر شام محو تماشا تھی۔۔۔۔۔



اس کی قربت میں ہے کیا بات نا جانے محسن

ایک لمحے کے لیے صدیوں کو بھلا دیتا ہے۔۔۔۔۔

موسم نے یکدم پلٹا کھایا تھا اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔۔۔۔۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوا

تو اسے دیکھ کے وہی ٹھہر گیا۔۔۔۔۔

سامنے وہ کالے رنگ کے کام دار شیفون کے سوٹ میں۔۔۔۔۔ بال کھولے۔۔۔۔۔ ہلکے میک

اپ کے ساتھ بہت حسین لگ گئی تھی

وہ وہی کھڑا محویت سے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دنیا میں اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام

نہیں۔۔۔۔۔

اس کے حکم کے مطابق وہ تیار ہو گئی تھی

اپنے چہرے پہ وہ نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ پلٹی تو۔۔۔۔۔ سامنے اسے کھڑا دیکھ کہ فوراً

سے نظریں جھکا لی۔۔۔۔۔

وہ چلتا چلتا اس کے قریب آیا

اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی۔۔۔۔۔

”تم آج اتنی حسین لگ رہی ہو کہ۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں تمہیں نظر بھر کے دیکھوں

گا تو۔۔۔۔۔ تمہیں نظر لگ جائے گی۔۔۔۔۔“

تھوڑی سے اس کا چہرہ اوپر کر کے۔۔۔۔۔ وہ مخمور لہجے میں بولا

تو وہ جھنپ گئی۔۔۔۔۔

”چلو۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں آج سیر پہ لے کے جانا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ پھر اس کے پیچھے چلنے لگی۔۔۔۔۔

سیڑھیاں اتر کے وہ جیسے ہی نیچے آئے۔۔۔۔۔

تو بوانے ایک نظر دونوں کو دیکھا۔۔۔۔۔

کالے رنگ کے کپڑوں میں وہاج۔۔۔۔۔ نہایت خوشگوار موڈ میں تھا۔۔۔۔۔ اور ساتھ سر

جھکائے زرپاش۔۔۔۔۔ کے چہرے پہ حیا کے رنگ تھے۔۔۔۔۔

”بے اختیار ان کی زبان سے نظر نہ لگنے کی دعا نکلی

جس پہ انہوں نے فوراً آمین کہا۔۔۔۔۔

تب تک وہ دونوں جاچکے تھے۔۔۔۔۔



وہ میرا کون ہے معلوم نہیں ہے

جب بھی ملتا ہے تو پہلو میں جگادیتا ہے۔۔۔۔۔

اس کچے پل کو اس کا ہاتھ تھام کے پار کرتے ہوئے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔۔۔۔۔ کہیں اس کے

وجود کے پیچھے چھپ کے ان نظاروں کو دیکھتے ہوئے ایک میٹھا سا احساس جاگا تھا۔۔۔۔۔ جسے

شاید محبت کہتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ زندگی کا ایک نیاروپ دیکھ رہی تھی جس میں صرف وہاج ہی

تھا۔۔۔۔۔ گھوڑے پہ اس کا ہاتھ پکڑ کے چڑھتے اور اس کے ساتھ گھڑ سواری کرتے ہوئے
اسے محسوس ہوا تھا وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔۔۔۔۔ وہ یہ جانتی تھی کہ سامنے موجود شخص نا
پائی دے رہا ہے لیکن محبت پائی داری یا نا پائی داری نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔ اسے یا بھی پتہ تھا
سامنے موجود شخص۔۔۔۔۔ کسی لمحے بھی بدل سکتے ہے لیکن محبت بدلنے کے رنگوں سے
ناواقف ہوتی ہے وہ تو بس ہوتی ہے تو بے حساب بے پناہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں
جانتی تھی وہ بس اس نرم گھاس تک پہنچنے تک صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ مکمل طور پہ اس کی
محبت میں ڈوب چکی ہے۔۔۔۔۔

وہاں کے موبائی ل کی رنگ ٹون نے اسے ہوش کی دنیا میں لایا۔۔۔۔۔
وہ اس وقت قدرے اونچی جگہ پہ گھاس پہ کھڑے تھے۔۔۔۔۔

سامنے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔۔۔۔۔ جو پتھروں کی مدد سے بنایا گیا تھا
باہر کرسیاں پڑی تھی

وہ دونوں بھی جا کے ایک کرسی پہ بیٹھ گئے۔۔۔۔۔

وہ ساتھ ساتھ موبائی ل پہ بھی مصروف تھا۔۔۔۔۔

وہ کھانے کا آرڈر دے کے کال سننے کے لیے سائیڈ پہ چلا گیا۔۔۔۔۔

اسی لمحے ایک چھوٹی بلی۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں کے پاس آ کے کھیلنے لگی۔۔۔۔۔ شاید وہ اس

ہوٹل کے مالک کی پالتو بلی تھی

بلیاں شروع سے ہی اس کی کمزوری تھی

وہاں ابھی تک کسی سے بات کر رہا تھا

اس نے بلی کو اٹھانے کی کوشش کی تو بلی اس کے ہاتھ سے نکل کے۔۔۔۔۔ ڈھلوان سے ہوتی

ہوئی نیچے کی طرف بھاگی

وہ بھی اٹھ کے اس کے پیچھے بھاگی۔۔۔۔۔

کافی دیر وہ بلی کو پکڑنے کی کوشش میں۔۔۔۔۔ مزے سے اس کے پیچھے بھاگتی رہی۔۔۔۔۔

مختلف سیاحوں نے گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا
کافی دیر بعد خود کو اس ویرانے میں پا کے اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا
بلی تو کافی آگے نکل گئی تھی وہ پیچھے رہ گئی تھی۔۔۔۔
اس نے واپس جانے کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ اب واپس نہیں جاپائے گی
اسے واپسی کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا
اسے وہاں کا خیال آیا۔۔۔۔
ابھی تک تو اسے پتہ چل گیا ہو گا۔۔۔۔
یہ راستہ کافی سنسان تھا۔۔۔۔ نیچے گہرا جنگل تھا
اسے خوف آرہا تھا۔۔۔۔
ادھر وہاں جب واپس نہ آیا تو زرخیز پاش کو وہاں نہ پا کر۔۔۔۔ وہ کافی پریشان ہو گیا تھا
ہوٹل کے مالک سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔۔۔۔

اس بات نے اس کی تشویش میں مزید اضافہ کیا۔۔۔۔۔
وہ نیچے کی طرف گیا اور وہاں موجود سیاحوں سے پوچھنے لگا۔۔۔۔۔
اور انہوں نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ لڑکی بلی کو پکڑتے ہوئے نیچے کی طرف گئی ہے
وہ پریشانی کے عالم میں اسی طرف گیا۔۔۔۔۔
جنگلی جانور کی دھاڑ سن کے وہ مزید سہم گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی
بوکھلا کہ اندھا دھند بھاگی
اور سامنے کسی چیز سے ٹکرا گئی اس نے دہشت بھری نظروں سے سر اس طرف
دیکھا۔۔۔۔۔
اور اس کی سانس میں سانس آئی
”وہاں وہ۔۔۔۔۔ ادھر کوئی ہے۔۔۔۔۔“
وہ روتے ہوئے اس کے سینے کے ساتھ جا لگی۔۔۔۔۔

زرپاش تم آخر چاہتی کیا ہو۔۔۔۔۔” کیوں مارنا چاہتی ہو مجھے۔۔۔۔۔؟“

اس نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کے جھنجھوڑا تھا۔۔۔

”تمہیں اگر کچھ ہو جاتا تو۔۔۔۔۔“

وہ تیزی میں بولتا ہی جا رہا تھا

وہ ہوش و حواس سے بیگانہ اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

”اگر میں وقت پہ نہ پہنچتا تو۔۔۔ کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔“ ہاں۔۔۔۔؟“

وہ غصے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔۔۔۔۔

لیکن وہ اس وقت اتنی ڈری ہوئی تھی۔۔۔۔۔ کہ اس پہ کسی ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہو رہا

قفا

”وہاج پلینز مجھے یہاں سے لے جائی ہیں۔۔۔۔۔“

وہ ایک دفعہ پھر اس سے لپٹ گئی۔۔۔۔۔

اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔۔۔۔

وہ سمجھ گیا کہ وہ ڈری ہوئی ی ہے۔۔۔۔

اس لیے مزید ڈانٹ کا ارادہ ملتوی کر کے۔۔۔۔ اسے تسلی دینے لگا



میں جو ٹوٹ کر بکھروں کبھی

وہ مجھ کو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے

آسمان پہ یکدم کالے رنگ کے بادلوں کا بسیرا ہو گیا تھا اور ہلکی ہلکی بوندہ باندی شروع ہو گئی

تھی۔۔۔۔۔ جس وقت وہ اس کے ساتھ چلتی چلتی۔۔۔۔ گاڑی تک پہنچی وہ دونوں اچھے

خاصے بھیگ چکے تھے۔۔۔۔۔

نومبر کی سرد ہواؤں میں۔۔۔۔۔ ٹھنڈک کی آمزش تھی۔۔۔۔۔ جس کی وجہ سے زرپاش

ہلکی ہلکی کانپنے لگی تھی۔۔۔۔۔

گاڑی میں بیٹھ کے وہاں نے اس کی حالت کے پیش نظر ہیٹر چلا دیا تھا۔۔۔۔

وہ سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں
موندے بیٹھی تھی

تھوڑی دیر میں ہی اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔۔۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کے چور نظروں سے وہاں کو دیکھ لیتی جس کے چہرے پہ
گہری سنجیدگی تھی

وہ اس کے بعد کچھ نہیں بولا تھا۔۔۔۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ فارم ہاؤس کے باہر تھے۔۔۔۔۔ وہ اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کے

اترا۔۔۔۔ اور پھر اس کی سائیڈ کا دروازہ کھولا۔۔۔۔۔ وہ سر جھکا کے اتر آئی

اور اس کے پیچھے چلنے لگی۔۔۔۔

”اندر آ کے وہ بوا کو آوازیں دینے لگا تھا۔۔۔۔۔

بوا اور چچی خانے سے تیزی سے باہر نکل کے آئی ی ایک نظر دونوں کے چہرے کی سنجیدگی
دیکھی۔۔۔۔۔

ان کے مزاج کافی بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔۔۔۔۔

”بوا ایک کپ چائے بچھوادے میرے کمرے میں۔۔۔۔۔“

سنجیدگی سے کہتا۔۔۔۔۔ وہ ذینے عبور کر گیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے پلٹ کے زرباش کی طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ زرباش کو یکدم خفت کے احساس
نے آن گھیرا۔۔۔۔۔

بوا بھی تک جانچتی نظروں سے۔۔۔۔۔ سر جھکا کے اپنا نچلا لب کچلتی زرباش کو دیکھ رہی
تھی۔۔۔۔۔

”بی بی جی آپ ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے۔۔۔۔۔ فکر مندانہ لہجے میں استفسار کیا۔۔۔۔۔

”جی ٹھیک ہوں میں“

وہ ذبردستی مسکرائی۔۔۔۔۔

تو بوا مطمئن بن تو نہ ہوئی لیکن۔۔۔۔۔ سر جھٹک کے کچن میں چلی گئی۔۔۔۔۔

اس نے چادر اتار کے صوفے پہ پھینکی اور خود بھی ادھر ہی ڈھ گئی



میں پہروں اسے کے سرہانے بیٹھا رہتا

ذرا جو بات کرے اب تمہارے بارے میں

شام کے سائے آہستہ آہستہ اس پتھروں سے بنے فارم ہاؤس کو اپنے حصار میں لے رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ جس وقت سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا۔۔۔۔۔ باہر شام کا ملحی اندھیرہ۔۔۔۔۔ پھیل چکا تھا۔۔۔۔۔ وہ جیسے ہی نیچے اتر کے آیا چونک گیا۔۔۔۔۔ وہ صوفے پہ ہی نیم دراز گہری نیند میں تھی۔۔۔۔۔ دوپٹہ صوفے سے ہوتے ہوئے نیچے کارپٹ پہ پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ کچن کی طرف گیا تو۔۔۔۔۔ بوا کھڑی برتن دھور ہی تھی۔۔۔۔۔

”بوا زری باہر کیوں سو رہی ہے۔۔۔۔۔“

فرنج میں سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے سرسری پوچھا۔۔۔۔۔

”پتہ نہیں صاحب جی۔۔۔۔۔ شاید تھکی ہوئی ی تھی تو بیٹھے بیٹھے یہی سوگئی ہیں۔۔۔۔۔“

بوانے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا

تو وہ سر ہلا کے باہر نکل گیا۔۔۔۔۔

ایک نظر اسے دیکھا۔۔۔۔۔ پھر ملازم کو آواز دے کے کمبل لانے کو کہا۔۔۔۔۔
ملازم کمبل لایا تو۔۔۔۔۔ اس پہ کمبل دے کے۔۔۔۔۔ وہ دوبارہ کمرے کی طرف بڑھ
گیا۔۔۔۔۔ زری کی آج والی حرکت اسے ٹھیک ٹھاک بری لگی تھی۔۔۔۔۔ اس لیے وہ اس سے
بات کرنے سے گریز پاتا تھا۔۔۔۔۔

”بوا کھانا تیار ہوا تو۔۔۔۔۔ زری کو جگا کے کھانا کھلا دیجی مئے گا۔۔۔۔۔

میں کھانا نہیں کھاؤنگا

بوا کو بتا کے وہ۔۔۔۔۔ سونے کے لیے چلا گیا تھا۔۔۔۔۔



اپنے شہر کے سب لوگوں سے

میری خاطر کیوں الجھے ہو۔۔۔۔۔

شام کے ملحی اندھیرے کی جگہ رات کی سیاہی نے لے لی تھی۔۔۔۔ اور چھت پہ لٹکتی جلتی بجتی
بتیاں اس اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے جگنو کی طرح معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اندر کوٹھا
ویران پڑا تھا۔۔۔۔۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے زرباش کا کمرہ اس کے جانے کے
بعد سے ہی بند پڑا تھا۔۔۔۔۔ نگار بیگم۔۔۔۔۔ صوفی پہ ٹانگ ٹانگ رکھ کے
بیٹھی۔۔۔۔۔ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔۔۔۔۔
وہاں سے ہوتے ہوئے جاؤ۔۔۔۔۔ تو بڑے کمرے کی بتی بھی ابھی تک جل رہی
تھی۔۔۔۔۔
وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے ٹانگیں لمبی کی مئے نیم ددراز تھی۔۔۔۔۔
اس کے پاؤں کی طرف بیٹھی ملازمہ۔۔۔۔۔ اس کے ناخنوں پہ نیل پینٹ لگانے کے ساتھ
ساتھ اس کی خوشامد کرنے میں مصروف تھی
جنہیں وہ غائب دماغی سے سن رہی تھی۔۔۔۔۔

اس کا سارا ذہن آنے والی فلم کی طرف تھا۔۔۔۔۔ کل ہی وہ آڈیشن دے کے آئی تھی اور کافی پر امید بھی تھی۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ پروڈیوسر کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے۔۔۔

”اب تو وہ اپنے مستقبل کی۔۔۔۔۔ کامیابیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔ جب اس کے بچتے موبائی ل نے اس کی سوچوں میں خلل پیدا کیا۔۔۔۔۔ اس نے جھنجھلا کے فون اٹھایا۔۔۔۔۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے موبائی ل چھوٹے چھوٹے بچا۔۔۔۔۔ وہ یکدم سیدھی ہو کے بیٹھی۔۔۔۔۔ پاؤں پیچھے کیا تو ساری نیل پالش۔۔۔۔۔ بیڈ شیٹ کے ساتھ لگ گئی۔۔۔۔۔ ملازمہ نے بوکھلا کے۔۔۔۔۔ ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچا۔۔۔۔۔ لیکن وہ اس طرف متوجہ ہی کب تھی۔۔۔۔۔ اس کی ساری توجہ ابھی تک۔۔۔۔۔ اسکرین پہ چمکتے نمبر پہ تھی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بے یقینی تھی۔۔۔۔۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ فون اٹھا کے کان کے ساتھ لگایا۔۔۔۔۔

”السلام وعلیکم صدیقی صاحب۔۔۔۔۔“

اس کے ہر الفاظ سے خوشی چھلک رہی تھی۔۔۔۔۔

دور۔۔۔۔۔ آفس میں بیٹھا وہ۔۔۔۔۔ پچاس ساٹھ سالہ تھری پیس پہنے۔۔۔۔۔ ٹانگ پہ

ٹانگ چڑھا کے بیٹھا شخص۔۔۔۔۔ جس نے انگلیوں میں سگار دبار کھا تھا۔۔۔۔۔ اس سے

حال احوال دریافت کر رہا تھا۔۔۔۔۔

پھر وہ یکدم کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اور کھڑکی کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ سامنے سے اسلام

آباد شہر دیکھائی دے رہا تھا

”رانی میڈم۔۔۔۔۔ ہم نے۔۔۔۔۔ آپ پہ کافی غور کیا۔۔۔۔۔ لیکن ہمیں لگتا

ہے۔۔۔۔۔ آپ اس فلم کے لیے موزوں نہیں ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے۔۔۔۔۔ ٹھہر ٹھہر کے کہا۔۔۔۔۔

تو دور کوٹھے میں بیٹھی رانی۔۔۔۔۔ کے چہرے کی جوت بجھ گئی۔۔۔۔۔ اسے سمجھ نہیں
آ رہی تھی وہ کیا کہے۔۔۔۔۔ یہ فلم اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔۔۔۔۔
”لیکن کیوں۔۔۔۔۔“؟ کل تک تو آپ۔۔۔۔۔ پوری طرح تیار تھے مجھے فلم دینے کے
لیے۔۔۔۔۔ آج کیا ہو گیا۔۔۔۔۔؟“
وہ تیز لہجے میں استفسار کر رہی۔۔۔۔۔
لہجے میں بے بسی تھی۔۔۔۔۔
”ہاں جی کل۔۔۔۔۔ تک مجھ پہ پریشور نہیں تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب مجھ پہ پریشور ہے۔۔۔۔۔“ کہ
یہ فلم آپ کے علاوہ اور کوئی ی بھی کر لے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ آپ نہ
کریں۔۔۔۔۔ اب آپ کے لیے میں اپنے تعلقات تو خراب نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“
اس نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں تحلیل کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں۔۔۔۔۔ اسے آگاہ
کیا۔۔۔۔۔

”کیا مطلب کس کا پریشتر۔۔۔۔۔؟“

اس نے صوفے پہ بیٹھ کے نا سمجھی سے کہا۔۔۔۔۔

”وہاج خان۔۔۔۔۔“

اس نے سگریٹ۔۔۔۔۔ پاس ڈسٹ بن میں پھنکتے ہوئے۔۔۔۔۔ صاف گوئی سے
کہا۔۔۔۔۔

تورانی کا دماغ بھک کے اڑ گیا۔۔۔۔۔

اس نے بامشکل۔۔۔۔۔ خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔۔۔۔۔

”آپ نا انصافی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ صدیقی صاحب۔۔۔۔۔ آپ مجھے وہاج کا نمبر دیں وہ

میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے۔۔۔۔۔ انہیں احساس دلانے کی نا ممکن کوشش کی۔۔۔۔۔

وہ شدید بے بس دیکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے وہاں پہنچ جی بھر کے غصہ آرہا تھا۔۔۔۔۔

اتنا تو اسے اندازہ تھا ہی نہیں کہ وہ اتنی آسانی سے اسے معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ اسے بالکل بھی علم نہیں تھا کہ وہ اسے ایسی مار بھی دے سکتا ہے۔۔۔۔۔

”یہ تو آپ کو ان بڑے لوگوں کے۔۔۔۔۔ ساتھ بگاڑنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا خیر میری طرف سے معذرت۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ آپ اور وہاں آپس میں طے کر لیں۔۔۔۔۔ میں نمبر آپ کو فاروڈ کر دیتا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔۔۔۔۔ ہے میری پہلی ترجیح آپ ہی ہیں۔۔۔۔۔“

وہ دوبارہ۔۔۔۔۔ کرسی پہ آ بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ اور اب خود کو اس معاملے سے الگ کر چکا تھا۔۔۔۔۔

رانی نے غصے سے فوراً گال کاٹ کے۔۔۔۔۔ موبائی ل بیڈ پہ اچھال دیا۔۔۔

اور خود۔۔۔۔۔ سر دونوں ہاتھوں میں دے کے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔

سائی یڈپہ خاموشی سے کھڑی ملازمہ۔۔۔۔۔ نے اس پہ ایک ملامتی نگاہ ڈالی پر بولی کچھ
نہیں۔۔۔۔۔

”اس کے موبائل کی مسیج ٹون نے ایک دفعہ۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اسے اس طرف متوجہ کیا۔۔۔۔۔

وہ ہدیائی کیفیت میں اٹھی اور۔۔۔۔۔ موبائیل اٹھایا۔۔۔ سامنے صدیقی کا نمبر چمک رہا

تھا۔۔۔ اس نے وہاں کا نمبر اسے فاروڈ کر دیا تھا

اب وہ تیزی سے کسی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”اسی لمحے دور وادی سوات۔۔۔۔۔ کے اس فارم ہاؤس کے۔۔۔۔۔ کمرے

میں۔۔۔۔۔ اس کا موبائی ل مسلسل بج رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ واش روم سے نکلا۔۔۔۔۔ ہاتھ میں پکڑا۔۔۔۔۔ تولیہ۔۔۔۔۔ بیڈ پہ پھینکا۔۔۔۔۔
اس کے بال گیلے تھے۔۔۔۔۔ وہ اس وقت سادہ سی ٹراؤزر شرٹ میں تھا۔۔۔۔۔
اس نے موبائی ل ہاتھ میں لیا اور غیر شناسہ نمبر دیکھ کے چونک گیا۔۔۔۔۔
کچھ سوچ کے اس نے کال اٹھائی۔۔۔۔۔ اور موبائی ل کان کے ساتھ لگا لیا۔۔۔۔۔
”دوسری طرف۔۔۔۔۔ وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح اس پہ جھپٹی تھی۔۔۔۔۔
”تم خود کو سمجھتے کیا ہو وہاج خان۔۔۔۔۔“؟ اتنی گھٹیا حرکت کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے
ہو۔۔۔۔۔“؟

وہ خلق کے بل چلائی تو اس نے موبائی ل کان سے ہٹا کے ایک نظر دیکھا۔۔۔۔۔
پھر تمیز سے مخاطب ہوا۔۔۔۔۔
”معذرت میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔۔۔۔۔“؟ شاید غلط نمبر ڈائی ل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“
اس نے اپنا لہجہ دھیمار کھنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تم پہچانوں گے بھی کیسے۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔“ تم نے توجو کرنا تھا وہ کر چکے تم۔۔۔۔۔ کیا مل گیا تمہیں۔۔۔۔۔ مجھ سے فلم کارول چھین کے۔۔۔۔۔“؟
وہ زہر خند لہجے میں بولی۔۔۔۔۔ تو دوسری طرف اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹ پھیل گئی۔۔۔۔۔

”اوہ میں تو رو نگ نمبر سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن آپ تو ہمارے ڈسے ہوئے لوگ ہیں۔۔۔۔۔“
وہ ذور سے ہنسا۔۔۔۔۔ تو اس کو آگ لگا گیا۔۔۔۔۔
اور تمہیں کیا مل گیا۔۔۔۔۔“؟ زری کو زہر دے کے۔۔۔۔۔“؟
اس نے طنزیہ لہجے میں الٹا اس سے سوال کیا تھا۔۔۔۔۔
”میں۔۔۔۔۔ نے اسے زہر نہیں دی میں تمہیں کہہ چکی ہوں۔۔۔۔۔“؟
اس نے جھنجھلا کے کہا
”میں نے بھی صدیقی کو منع نہیں کیا۔۔۔۔۔“

اس نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دو بدو کہا۔۔۔۔

”لیکن تم نے منع کیا ہے۔۔۔۔“

اس نے اپنی بات پہ زور دیا۔۔۔۔

”ہاں تم نے بھی اسے زہر دی ہے۔۔۔۔ اور میں نے چھوٹا سا بدلہ لیا ہے بس اور کچھ

نہیں۔۔۔۔۔“

اس نے اس کی بات کو ہوا میں اڑا دیا۔۔۔۔

”تمہیں یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے۔۔۔۔ میری پوری زندگی کا سوال ہے۔۔۔۔“

وہ روہانسی ہوئی

”اس کی بھی پوری زندگی کا ہی سوال تھا۔۔۔۔۔“

اس نے جتاتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کے ادا کیا۔۔۔۔

”بس کرو۔۔۔۔۔ اگر اتنی پرواہ ہوتی تمہیں تو یوں لاوارثوں کی طرح چھوڑ کے نہ جاتے
اسے۔۔۔۔۔“

وہ بھی ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔۔۔۔۔

اسے پتہ تھا وہ یوں ماننے والا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے اپنی سابقہ جون پہ لوٹ آئی
”وہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ میرا جیسا دل چاہے گا ویسا سلوک کروں گا اس کے ساتھ لیکن کسی
کو بھی اتنا حق نہیں دوں گا کہ اس کے ساتھ کچھ بھی غلط کرے۔۔۔۔۔ تمہارے لیے ابھی
کے لیے یہ موت کافی ہے۔۔۔۔۔ اگر آئی نہ۔۔۔۔۔ تم نے میری بیوی کے ساتھ کچھ غلط
کرنے کا سوچا بھی تو میں تمہیں اس سے بھی بری موت دوں گا۔۔۔۔۔ لاوارث نہیں ہے وہ
وہاں خان کی بیوی ہے۔۔۔۔۔“

سختی سے اسے وارن کر کے۔۔۔۔۔ کال کاٹ دی تھی۔۔۔۔۔

اس نے چلا کے فون دیوار کے ساتھ دے مارا تھا

یہ اس کی سب سے بڑی شکست تھی جو اسے وہاں خان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی



انا مقابل ہو تو ہم پسپا نہیں ہوتے۔۔۔۔

محبت مقابل آئے تو ہم سب کچھ ہار جاتے ہیں۔۔۔۔

صبح کا سورج۔۔۔۔۔ اپنے اندر نئی امنگیں۔۔۔۔۔ امیدیں سموئے اس وادی

کے۔۔۔۔۔ اوپر اتر اتر تھا۔۔۔۔۔ آج آسمان پہ سورج چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ رات کو ہونے والی

بوند اباندی کے آثار ابھی بھی پتوں پر موجود تھے۔۔۔۔۔ لان کی نرم گھاس ابھی تک گیلی

تھی۔۔۔۔۔

وہ رات کو وہاں کے موڈ کو دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔ کمرے میں نہیں گئی تھی۔۔۔۔۔ اور نیچے

ہی کمرے میں سو گئی تھی۔۔۔۔۔

ابھی سورج کی پردہ چیر کے آتی کر نیں اس کے چہرے تک آئی تو اس نے کسمسا کے آنکھیں
کھولی۔۔۔۔۔

کچھ دیر سستی سے ادھر ہی لیٹی رہی پھر اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔ بالوں کا

جوڑہ۔۔۔۔۔ بنایا۔۔۔۔۔ پاؤں میں سلیپر اڑس کے۔۔۔۔۔ باہر نکل آئی۔۔۔۔۔

کچن سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھی۔۔۔۔۔ دائیں طرف والے صوفے پہ وہ
بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔۔۔۔۔

اس وقت وہ سادے سے ٹریک سوٹ میں تھا شاید وہ ابھی بھی واک کر کے آیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے اخبار سے نظر اٹھا کے۔۔۔۔۔ اسے دیکھا۔۔۔۔۔ تو وہ نظر چراگئی۔۔۔۔۔

”بوا۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آجائیں باہر۔۔۔۔۔ آج سے میرا ناشتہ زرپاش بنائے گی۔۔۔۔۔“

اس نے اخبار پہ نظر دوڑاتے ہوئے۔۔۔۔۔ عام سے لہجے میں حکم جاری کیا

تو اس نے چونک کے سر اٹھایا تھا

”لیکن صاحب جی میں ہوں جو بیگم صاحبہ کو بنانے کی کیا ضرورت ہے۔۔“؟

بوا کچھ تذبذب کا شکار تھی۔۔۔۔

”ہاں مجھے پتہ ہے آپ ہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے سارے کام یہ خود کرے۔۔۔۔۔“

اس نے جانچتی نظروں سے زرباش کو دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔ سنجیدگی سے کہا

زرباش کو اس کے لہجے میں کہیں بھی طنز نظر نہ آیا

بوانے بات ماننے میں ہی عافیت جانی

اس لیے ایک سائیڈ ہو کے۔۔۔۔۔ کھڑی ہو گئی

وہ سر ہلا کے کچن میں چلی گئی

چائے کا پانی چڑھا کے فریج میں سے آٹا نکال کے جیسے ہی مڑی تو پیچھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے
سینے کے ساتھ ٹکرا کے اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔۔۔۔۔ جس کا گلا وہاں نے اس کے
منہ پہ ہاتھ رکھ کے گھونٹ دیا۔۔۔۔۔

اس کی یہی عادت تھی کہ دبے پاؤں اس کے پیچھے آ کے کھڑا ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔
”یار تم ہر وقت اتنی ڈری ہوئی کیوں رہتی ہو۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک دفعہ پھر اس کی اڑی ہوئی رنگت کو دیکھ کے جھنجھلا اٹھا۔۔۔۔۔
وہ اس سے نظر بچا کے چائے میں دودھ ڈالنے لگی۔۔۔۔۔

”تمہاری طرف معذرت کا رواج نہیں ہے کیا؟“ مطلب کوئی خفا ہو تو بھاڑ میں
جائے۔۔۔۔۔

وہ برا سا منہ بنا کے۔۔۔۔۔ ملامت بھرے لہجے میں بول رہا تھا
اور وہ سنی ان سنی کر کے کھڑی تھی۔۔۔۔۔

”یار تم شوہر کو کوئی اہمیت دینا جانتی بھی ہو کیا۔۔۔۔۔؟“

اس نے بازو سے پکڑ کے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ کے تپ کے کہا۔۔۔۔۔

”آپ دیتے ہیں بیوی کو اہمیت۔۔۔۔۔؟“

وہ شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔۔۔۔۔

اس نے بامشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔۔۔۔۔

”لو اور کس طرح دوں اہمیت۔۔۔۔۔؟“

وہ یکدم انجان بنا۔۔۔۔۔

ساتھ ہی باسکٹ میں سے سیب۔۔۔۔۔ نکالا۔۔۔۔۔ شلف پہ بیٹھ گیا۔۔۔۔۔

وہ اسے ایک نظر گھور کے رہ گئی

اس کی ناراضگی خود بخود ختم ہو گئی تھی۔۔۔۔۔

وہ دل ہی دل میں خوش تھی اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”تم اگر مجھ سے معذرت کر لو تو شاید میرا غصہ ختم ہو جائے۔۔۔۔۔“؟

اس نے مصنوعی حقکی سے کہہ کے رخ دوسری طرف موڑ لیا

”مجھے فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔“

اس نے لاپرواہی کی ظاہر کی

اسی لمحے اس کی نظر اس کے ہاتھ پہ گئی تو وہ دھک سے رہ گئی۔۔۔۔۔

اس کے ہاتھ پہ شاید سیب کاٹے ہوئے چھری لگی تھی اور ہاتھ سے خون کی ایک پتلی لکیر نکل

کے شیف سے ہوتی ہوئی ذمین پہ گر رہی تھی

لیکن وہ یوں مطمئن بن بیٹھا تھا۔۔۔

جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔۔۔۔

”وہاں۔۔۔۔۔ آپ کے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے۔۔۔۔۔“

وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے خون روکنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

وہ بس تنقیدی نظروں سے اس کی یہ حرکت دیکھ کے رہ گیا۔۔۔۔۔

وہ اس سے اس حد تک بیقراری کی امید نہیں کر سکتا تھا

”اس نے اپنے دوپٹے کے پلو کو اس کے ہاتھ پہ باندھتے یکدم۔۔۔۔۔ نظر اٹھا کے۔۔۔۔۔ اس کی

آنکھوں میں دیکھا تو ہاتھ پہ اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔۔۔۔۔

اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔۔۔۔۔

لیکن سامنے بیٹھا شخص سمجھ چکا تھا۔۔۔۔۔

”سنو محبت تو نہیں کر بیٹھی کہیں تم۔۔۔۔۔“

وہ ایک ابرو اٹھا کے پوچھ رہا تھا۔۔۔۔۔

اور وہ منہ کھول کے اسے دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔۔



آنکھ رو رو کے تیری راہ تکا کرتی تھی

دل تیری یاد سے مغلوب رہا ہے کچھ دن۔۔۔۔

پل پل بدلتے موسم نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا تھا۔۔۔۔ وقفے وقفے کے بعد ملکہ کو ہسار کے

اونچے پہاڑوں پہ ہونے والی بر فباری نے۔۔۔۔۔ دسمبر کی سردی میں اضافہ کیا

تھا۔۔۔۔۔ ابھی بھی کچھ دیر پہلے ہونے والی بر فباری ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی

تھی۔۔۔۔۔ آسمان سے برستے روئی کی

کے نرم گولوں کی آواز اس چھوٹے پتھروں کے بنے گھر میں سنائی دے رہی تھی جہاں

ایک طرف۔۔۔۔۔ آتش دان میں آگ جل رہی۔۔۔۔۔ اور ایک طرف وہ بیٹھی تھی

باہر موسم کی رنگینی قابل دید تھی اور اندر بیٹھی لڑکی کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی تھی۔۔۔۔

وہ گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھی خاموش افسردہ سی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔

ہلکے آسمانی رنگ کی سادہ قمیض شلوار میں۔۔۔۔۔ بالوں کی چٹیا بنارکھی تھی۔۔۔۔۔ اس کا سیاہ رنگ اور بجھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔۔۔۔۔

اس نے ایک افسردہ نظر کیلنڈر پہ ڈالی۔۔۔۔۔

اسے گمے آج پانچ روز گزر گئے تھے۔۔۔۔۔ اسے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا ہے۔۔۔۔۔ یا اٹلی واپس چلا گیا ہے۔۔۔۔۔

لیکن اسے ایک مبہم امید تھی کہ شاید وہ لوٹ آئے

اسی لمحے باہر ڈور بیل بج اٹھی۔۔۔

وہ ایک دم سہم کے خود میں سمٹ گئی اور خوفزدہ نظروں سے۔۔۔۔۔ بند دروازے کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔

مفتی صاحب کی موت کے بعد وہ یوں بھی اکیلی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ تب ہی وہ ذرا سی
آہٹ پہ سہم جاتی تھی۔۔۔

دروازہ اب مسلسل بج رہا تھا۔۔۔۔۔
اور وہ اتنی ہمت بھی نہیں کر پار ہی تھی کہ دروازہ کھول سکے۔۔۔۔۔
اسے اپنی بے بسی پہ جی بھر کے رونا آیا۔۔۔۔۔
دروازہ بجانے والے کے ہاتھوں میں برق رفتاری آئی تھی۔۔۔۔۔
شاید باہر بر فباری تیز تھی۔۔۔۔۔
اسے محسوس ہوا خوف کی وجہ سے اس کا دل اچھل کے خلق میں آجائے گا
کچھ ہمت کر کے اس نے خود کو سنبھالا۔۔۔۔۔
”ککک کون۔۔۔۔۔“
بامشکل اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی
دسمبر کی اس تیخ بستہ سردی میں اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی
”میں ہوں شہباز۔۔۔۔۔“ ”دروازہ کھولو۔۔۔۔۔“

جھنجھٹائی ہوئی آواز۔۔۔۔۔ اسے زندگی کی نوید معلوم ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اس
احساس نے کہ وہ اس کے باہر کھڑا ہے اس میں تیزی بھر دی تھی۔۔۔۔۔ وہ ماتھے سے
پسینہ پونچھتی اٹھی اور تیزی سے دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔
سامنے اسے دیکھ کے اس کا رکاوٹا سا سانس بحال ہوا۔۔۔۔۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت کی جگہ
حیا کی لالی نے لے لی۔۔۔۔۔ اس کی دل کی سرزمین پہ پھول کھل اٹھے تھے وہ شدت جذبات
میں اس قدر غرق تھی کہ سامنے موجود شخص کی آنکھوں کی بیزاری بھی نہ دیکھ
پائی۔۔۔۔۔
اور اس سے لپٹ گئی۔۔۔
وہ ہکا بکارہ گیا تھا وہ اس بات کی امید نہیں رکھتا تھا۔۔۔
”شکر ہے خدا پاک کا۔۔۔۔۔ آپ آگئے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔۔۔۔۔“
وہ ان کے ساتھ لپٹ کے اپنائیت بھرے لہجے میں شکوہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔

کچھ دیر کے لیے ان کا دل موم ہوا۔۔۔۔۔ انہیں اس سیاہ فام لڑکی سے ہمدردی محسوس
ہوئی جو واقعی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔۔۔۔۔

اگلے ہی لمحے ان کی نظر اس کے سیاہ ہاتھوں پہ گئی تو انکی ہمدردی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی
اس کی جگہ سختی نے لے لی انہیں اس لڑکی کی رنگت سے کرخت محسوس ہوتی تھی۔۔۔۔۔ وہ
شروع سے ہی رنگین مزاج حسن کے دلدادہ۔۔۔۔۔ گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی
سے شادی کرنے والے۔۔۔۔۔ مہر النساء کے خوبصورت سفید ہاتھ ان کی نظروں کے سامنے
گھوم گئے۔۔۔۔۔ وہ لاشعور میں دونوں کا موازنہ کرنے لگے۔۔۔۔۔ قسمت نے ان کے
ساتھ بہت گھناؤنا۔۔۔۔۔ مذاق کیا تھا

انہوں نے زبردستی اسے خود سے الگ کیا تو اسے ہوش آیا۔۔۔۔۔ اپنے شوہر کے چہرے
کے بے پتھریلے تاثرات دیکھ کے اسے شدید خفت کے احساس نے آن گھیرا اسے
اپنی۔۔۔۔۔ جذباتیت کا شدت سے احساس ہوا تھا۔۔۔۔۔

لیکن جلدی ہی خود کو سنبھال کے وہ دروازہ ٹھیک سے بند کر کے۔۔۔۔۔ اس کو اندر لے
آئی۔۔۔۔۔

رجب نے ہاتھ میں پکڑے۔۔۔۔۔ شاپر زبیڈ پہ رکھے اور۔۔۔۔۔ خود جیکٹ اتار کے صوفے
پہ رکھی۔۔۔۔۔

وہ معمول سے ہٹ کے اس وقت۔۔۔۔۔ کالے رنگ کی قمیض شلوار میں تھا۔۔۔۔۔ اور اوپر
جیکٹ پہن رکھی تھی۔۔۔۔۔ شاید وہ حویلی سے آ رہا تھا۔۔۔۔۔

ہلکی ہلکی بڑھی شیوا اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہ سیدھا اس کے دل میں اتر رہا تھا۔۔۔
لیکن وہ اس کے ان جذبوں سے بے خبر۔۔۔۔۔ آتش دان کے سامنے بیٹھا۔۔۔۔۔ ہاتھ گرم
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی جو دانستہ اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لے رہا تھا
پھر بجھے دل کے ساتھ کچن میں چلی گئی۔۔۔

چائے کا کپ۔۔۔۔۔ لے کے وہ جس وقت واپس آئی۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں موندے بیڈ پہ نیم
دراز تھا۔۔۔۔۔

اس نے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھا

وہ اسے مخاطب کرنا چاہتی تھی لیکن اسی لمحے اس کا موبائی ل بجا اور وہ موبائی ل ہاتھ میں لے
کے اٹھ بیٹھا۔۔۔۔۔ اس کے لبوں پہ تبسم بکھر گیا اور نام نہ پڑھتے ہوئے بھی وہ یقین سے کہہ
سکتی تھی کہ دوسری طرف اس کی بیوی ہے۔۔۔۔۔

وہ کال پک کر کے اب اسے نظر انداز کیے۔۔۔۔۔ خوشگوار لہجے میں۔۔۔۔۔ مہر النساء
سے بات کر رہا تھا

اور وہ کسی غیر ضروری چیز کی طرح بیک میں چلی گئی تھی۔۔۔۔۔

کچھ دیر وہ یونہی کھڑی۔۔۔۔۔ انگلیاں مڑوڑتی رہی مگر جب گفتگو طویل ہو گئی تو وہ بجھے دل
کے ساتھ۔۔۔۔۔ ادھر سے نکل کے اپنے باپ کے کمرے میں آگئی۔۔۔۔۔

اسے اپنی کم مائی گی کاشدت سے احساس ہوا۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے گرم سیال بہنے لگا۔۔۔۔

اس کمرے میں ہر جگہ۔۔۔۔ اس کے باپ کی پر خلوص محبت کی خوشبو تھی۔۔۔۔۔
اس نے اپنے باپ کو ہمیشہ اپنی سیاہ فام ماں سے محبت کرتے دیکھا تھا اسے ان دونوں کی محبت پہ
رشتہ آتا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کا باپ اس کی ماں کی موت کا صدمہ لیتے ہوئے بستر کے ساتھ
جالگا تھا۔۔۔۔۔

اسے آج اس بات کاشدت سے احساس ہوا تھا۔۔۔۔۔ کہ صرف ماں باپ کی بے لوث محبت کا
ہی اتنا حوصلہ ہے کہ وہ اولاد کی رنگت۔۔۔۔۔ حسن۔۔۔۔۔ بد صورتی کچھ نہیں
دیکھتی۔۔۔۔۔ باقی محبتوں کی تو قیمتیں اور معیار ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اسے اس چیز کا بھی
احساس شدت سے ہوا تھا کہ۔۔۔۔۔ اگر آپ حسین نہیں ہیں تو محبت کی دنیا میں آپ کی

کوئی جگہ نہیں ہے اسے نہیں پتہ تھا یہ معیار کس کے قائم کردہ ہیں لیکن اب اسی پہ دنیا
چل رہی تھی اور اسے ان کے ساتھ چلنا تھا۔۔۔۔۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی اسے اتنا تو حوصلہ تھا کہ پاس نہ سہی وہ ساتھ تو
ہے۔۔۔۔۔ اب وہ سکون سے سو سکتی تھی۔۔۔۔۔ کیونکہ اب اسے تحفظ کا احساس تھا پچھلی
کچھ راتیں تو اس نے جاگ کے کاٹ دی تھی



میں شاید پھر نہ لکھتا اس کو اپنی خبر
محبت کا بھرم رکھنا تھا کچھ دل بے اختیار بھی تھا
”سنو محبت تو نہیں کر بیٹھی کہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک ابرو اٹھائے۔۔۔۔۔ اس کو جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔ پوچھ رہا تھا
اور وہ کچھ بھی جواب دیے بغیر تھوڑی دیر اس کا چہرہ تکتی رہی۔۔۔۔۔

وہ اس سے اس سوال کی توقع نہیں کر سکتی تھی اور کم از کم اس حد تک صاف گوئی کی تو بالکل نہیں۔۔۔۔۔ اپنی چوری اتنی جلدی پکڑے جانے پہ اس نے نظریں چرائی۔۔۔۔۔ اس کا دل چاہا اس کے پاس کوئی ایسا جادو ہو کہ وہ خود کو گم کر لے۔۔۔۔۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔۔۔۔۔ وہ رخ موڑ کے۔۔۔۔۔ خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔۔۔۔۔ چائے سوکھ کے دیکھی کے ساتھ لگ چکی تھی۔۔۔۔۔

”خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔۔۔۔۔“ اور اقرار بھی

اس نے مزے سے ہانک لگائی۔۔۔۔۔

وہ اسے یکسر نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف رہی۔۔۔۔۔

”یار تم گونگی ہو کیا۔۔۔۔۔“ ”پوچھا ہے تم سے کچھ۔۔۔۔۔“

وہ جی بھر کے بد مزہ ہوا چھلانگ لگا کے اس کے بالکل سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔

اب فرار کا راستہ کوئی ی نہیں تھا۔۔۔۔۔

”ہاں تو۔۔۔۔۔ تمہیں کہیں اپنے ہینڈ سم گڈ لکنگ شوہر سے محبت تو نہیں ہو
گئی۔۔۔۔۔“

اس نے فخریہ کالر جھاڑے۔۔۔۔۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“

اسے اور کوئی ی بات نہ سو جھی تو۔۔۔۔۔ جان چھڑانے کے انداز میں بولی۔۔۔۔۔

”کیا مطلب کیسی باتیں۔۔۔۔۔ میں کون سا۔۔۔۔۔ تم سے رو مینس جھاڑ رہا

ہوں۔۔۔۔۔ صرف پوچھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ سادہ سی بات۔۔۔۔۔“

وہ نارمل سے انداز میں بولا۔۔۔۔۔

”ویسے اگر تمہیں محبت ہو بھی گئی ہے۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تمہارا قصور

نہیں۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ میرے جیسے بندے سے محبت کرنے سے انسان خود کو روک بھی
کہاں سکتا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے شلیف پہ کہنی ٹکا کے اس کے قریب ہو کے۔۔۔۔۔ فخر یہ لہجے میں کہا۔۔۔
”لیکن ایک بات یاد رکھنا محترمہ زرا پاش صاحبہ مجھ سے محبت کرنے کی بھول مت کیجیئے
گا۔۔۔۔۔ آپ کے بڑے بول اور تھپڑ کی تذلیل ہو جائے گی مجھ جیسے گھٹیا انسان سے محبت کر
بیٹھی تو۔۔۔۔۔ یہ تو محبت کو گالی دینے کے مترادف ہو انہ۔۔۔۔۔ اور یوں
بھی۔۔۔۔۔ میں کوئی ی پائی دیا رہتا ہوں تو ہوں نہیں۔۔۔۔۔ اس لیے ذرا سوچ
کے۔۔۔۔۔“

اس کے چہرے کے پتھریلے تاثرات اور تپش بھرالہجہ اسے بہت کچھ جتا گیا تھا۔۔۔۔۔
کہ اس کی کیا جگہ ہے وہاں کی زندگی میں۔۔۔۔۔ ایک بدلہ ایک دل بھلانے کی چیز۔۔۔۔۔

اس کا دل بری طرح دکھاتا تھا

وہ تڑپ کے پلٹی تھی ----

”کیا ---- آپ بھول نہیں سکتے اس تھپڑ کو ----“

وہ تڑپ کر بولی ----

تو اس کے لبوں پہ ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی ----

”نہیں میری جان تھپڑ کو اتنی جلدی نہیں بھلایا جاتا ---- شاید اور لوگ بھول جاتے ہو

لیکن وہاں خان اتنی آسانی سے بھولنے والے لوگوں میں سے نہیں ہے ----“

اس نے اس کی لٹھ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بظاہر نرمی سے کہا مگر ---- اس کے لہجے کی

کاٹ اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی ----

وہ ایک کاٹ دار نگاہ اس پہ ڈال کے باہر نکل گیا تھا

اور ایک لمحے میں اس کی خوش فہمی ہو ابن کے اڑگئی تھی ----



بارشِ سنگ سے پہلے ذرا یہ سوچ تو لیا ہوتا۔۔۔۔۔

تیرا محسن تیرا محبوب رہا ہے کچھ دن

رنگِ برنگی بتیوں سے مزین اس کوٹھے میں۔۔۔۔۔ رات پورے آب و تاب سے اتری

تھی۔۔۔۔۔ ایسے میں کوٹھے میں مکمل سکوت تھا اور سناٹے کا راج تھا۔۔۔۔۔ بڑے

کمرے میں نگار بیگم۔۔۔۔۔ رقص کی محفل سجائے بیٹھی تھی ساتھ ہی حقایقے میں

مصروف تھی۔۔۔۔۔ بڑے کمرے میں۔۔۔۔۔ وہ اونچے اور سٹالش بیڈ پہ کہنیوں کے بل الٹی

لیٹی مزے سے۔۔۔۔۔ موبائی لپہ۔۔۔۔۔ کسی کا نمبر ڈائی ل کرنے میں مصروف

تھی۔۔۔۔۔

اس کے چہرے کے پہ عجیب سی دل جلانے والی مسکان تھی۔۔۔۔۔ پہلے کی نسبت وہ اب کافی

پر سکون دیکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔

دوسری طرف سے استفسار کیا گیا تھا۔۔۔۔۔

”مشہور سیاسی شخصیت۔۔۔۔۔ میر دار کے پوتے اور۔۔۔۔۔ بزنس ٹائی یون۔۔۔۔۔ شہباز
خان کے بیٹے۔۔۔۔۔ نے ایک مشہور رقصہ زرخش سے۔۔۔۔۔ خفیہ طور پہ نکاح کر لیا
ہے۔۔۔۔۔“

اس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے ڈرامائی انداز میں کہا۔۔۔۔۔

تو دوسری طرف۔۔۔۔۔ موجود نیوز رپورٹر۔۔۔۔۔ بے تابی سے اس سے پوچھ رہی
تھی۔۔۔۔۔ وہ اس سے تصدیق چاہتی تھی۔۔۔۔۔

”جی جی۔۔۔۔۔ میرے کوٹھے کی ہی رقصہ ہے۔۔۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے نکاح
ہوا ہے۔۔۔۔۔“

وہ سیدھی ہو کے بیٹھی پھر معصومانہ انداز اپنایا۔۔۔۔۔

”ہاں اگر آپ کہتے ہیں تو میں ٹی وی پہ آ کے بیان دینے کو بھی تیار ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی

اسی لمحے ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔۔۔ اور اپنی مالکہ کے چہرے پہ پھیلی
مسکراہٹ۔۔۔۔۔ دیکھ کے ایک لمحے کے لیے چونک گئی۔۔۔۔۔
کل سے اس نے رورو کے اس کا دماغ کھالیا تھا اور اب تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے
دیکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔
”رانی بی بی پاگل تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔۔؟“
وہ منہ ہی منہ بڑبڑائی تو رانی نے۔۔۔۔۔ اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو
کہا۔۔۔۔۔
”جی۔۔۔۔۔ میں آپ کو اس کی تصویر بھی فارورڈ کر دیتی ہوں۔۔۔۔۔“
مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے فون بند کر کے۔۔۔۔۔ بیڈ پہ اچھالا اور ایک گہری سانس لیتے
ہوئے خود کو بھی بیڈ کے سپرد کر دیا۔۔۔۔۔
”رانی بی بی آپ ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔“

ملازمہ نے آگے بڑھ کے فکر مندی سے پوچھا۔۔۔

”ہاں میں تو اب ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اب وہ ٹھیک نہیں رہے گا۔۔۔۔۔ وہ کیا سمجھتا

ہے وہ۔۔۔۔۔ وہاج خان ہے تو میں بھی رانی ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے زہر خند لہجے میں فخریہ کالر جھاڑے۔۔۔۔۔

”اور کیا کہہ رہا تھا مجھے ایسی۔۔۔۔۔ موت دے گا۔۔۔۔۔“

ہاہاہاہہ اس کی نقل اتار کے زور سے ہنسی۔۔۔۔۔

”رانی بی بی لگتا ہے آپ بھی اس سے کوئی بڑا انتقام لے چکی ہیں۔۔۔۔“

ملازمہ نے رال ٹپکائی می تھی۔۔۔

ارے ابھی کدھر انتقام تو ابھی شروع ہوا ہے۔۔۔۔۔“

وہ چلتی چلتی کھڑکی تک گئی اور طنزیہ مسکرائی

”تھوڑی دیر بعد۔۔۔۔۔ یہ خبر میڈیا پہ آئے گی پھر جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی۔۔۔۔۔ اسے اپنے حسب و نسب پہ جو اتنا مان ہے یوں۔۔۔۔۔ چٹکیوں۔۔۔۔۔ میں نہ اڑ گیا تو کہنا۔۔۔۔۔

وہ چہرے پہ سختی سجا ئے۔۔۔۔۔ کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔

”ایک عزت کا ہی تو غرور ہے اسے۔۔۔۔۔ وہ بھی نہیں رہے گی تو کیا کرے گا بچارہ

۔۔۔۔۔ ”چی چی چی۔۔۔۔۔

اس نے مصنوعی ہمدردی چہرے میں سموتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”بڑا آیامیری بیوی۔۔۔۔۔“

پھر پتھر یلے تاثرات کے ساتھ بولی۔۔۔۔۔

”بیوی نہیں کوٹھے والی رقا صہ۔۔۔۔۔“

وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔۔۔۔۔

حسب ونسب نہیں۔۔۔۔۔“

وہ شیشے کے پاس جا کے کھڑی ہوئی شیشے میں اس کا عکس واضح تھا۔۔۔۔۔

وہ اس وقت ایسی زہریلی ناگن لگ رہی تھی۔۔۔۔۔ جو خود کو ڈنگ مارنے کو تیار ہو۔۔۔۔۔

اور اس کے۔۔۔۔۔ سارے دعویٰ سچ ثابت ہوئے تھے۔۔۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں۔۔۔۔۔ یہ

بن کے ٹوٹی تھی۔۔۔۔۔

بڑی حویلی کے وسیع سے۔۔۔۔۔ کمرے میں۔۔۔۔۔ موت سناٹا تھا۔۔۔۔۔

گھر کی دونوں بہوؤں اور بیٹوں کو گویا سانپ سونگ گیا تھا۔۔۔۔۔

سب ایک دوسرے سے ہی نظریں چراتے پھر رہے تھے۔۔۔۔۔

میرداد نے جھنجھلا کے کوئی دسویں سال کاٹی۔۔۔۔ اور موبائی ل ہی آف کر دیا۔۔۔۔

”پھر قہر بھری نظروں سے۔۔۔۔۔ سامنے صوفے پہ بیٹھے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھا۔۔۔۔۔“

بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا جواب دوں۔۔۔۔۔ اب ان ہمارے ٹکڑوں پہ پلنے والے کتوں کو۔۔۔۔۔“

انہوں نے۔۔۔۔۔ کڑک دار لہجے میں کہا

تو جب خان نے نظر چراکے بے چینی سے پہلو بدلا۔۔۔۔۔

”انتخابات سر پہ ہیں۔۔۔۔۔ اور نواب زادے کی عیاشیاں ہی ختم ہونے کو نہیں آرہی

ہیں۔۔۔۔۔ سیاسی مخالفین کا تو جیسے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اس خبر کے بعد۔۔۔۔۔“

انہوں نے۔۔۔۔۔ ملامت بھری نظروں سے اپنے بڑے بیٹے کو۔۔۔۔۔ گھورا۔۔۔۔۔

ان کے لہجے سے غصہ عیاں ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

شہباز خان اور مہر النساء اس سارے معاملے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے

تھے۔۔۔۔۔

”اگر اسے شادی کی اتنی ہی جلدی تھی۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ ہمیں بتاتا دنیا میں شریف لڑکیوں کا
قحط پڑ گیا تھا کہ بدنام زمانہ۔۔۔۔۔ کو اپنی بیوی بنا لیا۔۔۔۔۔“
وہ غصے سے کانپنے لگے تھے۔۔۔۔۔
”باباجان برا مت مانی مے گا لیکن۔۔۔۔۔ یہ سب آپ کی دی ہوئی شہ ہے۔۔۔۔۔“
شہباز خان نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا
تو رجب خان نے کھا جانے والی نظروں سے۔۔۔۔۔ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا
انہیں لگا وہ انہیں نیچا دکھا رہے ہیں۔۔۔۔۔
”باباجان۔۔۔۔۔ اسے بولیں یہ اس معاملے میں مت بولے۔۔۔۔۔
انہوں نے سختی سے ٹوکا تھا۔۔۔۔۔“

”کیوں نہ بولوں اس معاملے میں پوری زندگی جس پوتے اور جس بیٹے کے بل بوتے پہ آپ اور باباجان نے میری بیٹیوں پہ فوقیت دی آج اسے بیٹے نے آپ دونوں کے سروں پہ خاک ڈال دی۔۔۔۔۔“

وہ طنزیہ مسکرائے۔۔۔۔۔

”باباجان اسے کہیں خاموش رہے۔۔۔۔۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور تقریباً دھاڑنے والے انداز میں بولے تھے۔۔۔۔۔

شہباز پر سکون سے وہی کرسی پہ بیٹھے رہے اب ان کو تڑپتے دیکھنے کی باری۔۔۔۔۔ ان کی تھی۔۔۔۔۔

”مجھے تو خاموش کروالیں گے آپ دنیا کے منہ کیسے بند کروائی یں گے ساری میڈیا پہ

۔۔۔۔۔ آپ کے بیٹے اور اس رقصہ کے قصے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ تپش بھری نظروں سے۔۔۔۔۔ انہیں دیکھتے ہوئے جتائے بنے نہ رہ سکے۔۔۔۔۔

”تم زبان بند رکھو اپنی۔۔۔۔۔ میرے زخموں پہ نمک چڑھکنے کے بجائے اپنے گریبان میں
جھانکو۔۔۔۔۔“ خود ایک فحاشہ سے۔۔۔۔۔ خفیہ شادی کر رکھی تھی تم نے۔۔۔۔۔“
وہ ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ اس لیے آگے بڑھ کے۔۔۔۔۔ انہیں گریبان سے پکڑ لیا
تھا۔۔۔۔۔

مہر النساء نے ایک ناگوار نگاہ۔۔۔۔۔ شہباز خان پہ ڈالی۔۔۔۔۔
”بھائی جان۔۔۔۔۔ زبان کو لگام دیں۔۔۔۔۔“
وہ بھی دھاڑے تو۔۔۔۔۔ میرداد کی برداشت اب اتنی ہی تھی۔۔۔۔۔
انہوں نے آگے بڑھ کے دونوں کو ایک دوسرے سے چھڑوا یا۔۔۔۔۔
”حالات دیکھو اور تم دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہو۔۔۔۔۔“
انہوں نے دونوں کو جھاڑ پلائی
تو دونوں رخ موڑ کے کھڑے ہو گئے۔۔۔۔۔

”اسے فون کرو۔۔۔۔۔ اور اسے کہو ختم کرے یہ تماشہ۔۔۔۔۔ طلاق دے اس ناجائی زخون کو۔۔۔۔۔“

انہوں نے غرور سے۔۔۔۔۔ اگلا حکم نامہ جاری کیا۔۔۔۔۔
تو جب خان ایک دفعہ پھر اس کا نمبر ڈائی ل کرنے لگے۔۔۔۔۔
دور وادیوں میں۔۔۔۔۔ اس کا موبائی ل ایک دفعہ پھر بج اٹھا تھا۔۔۔۔۔
لیکن اس کا دماغ اس طرف تھا ہی کہاں۔۔۔۔۔
اس کی نگاہیں توٹی وی پہ چلتی۔۔۔۔۔ پیٹی پہ جم کے رہ گئی تھی
جہاں ایک اسٹالش سی نیوز رپورٹر گلا پھاڑ پھاڑ کے۔۔۔۔۔ وہاں کی شادی کے معاملے کو مریج
مسالہ لگا کے پیش کر رہی تھی۔۔۔۔۔
سب سے زیادہ شرم کی بات زرپاش کی وہ تصویر تھی جس کے ساتھ وہ رقصہ کا لفظ استعمال کر
رہی تھی۔۔۔۔۔

اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اندر دھنس جائے۔۔۔۔۔

”کیا ہے یہ وہاج خان کی شادی کا اسکینڈل۔۔۔۔۔“

”کون ہے یہ لڑکی۔۔۔۔۔ رقاہ طوائف یا کچھ اور۔۔۔۔۔“

”کیا یہ نکاح ہے بھی یا محظ ایک ناجائز رشتہ۔۔۔۔۔“

اور سب سے بڑی بات۔۔۔۔۔ وہاج خان۔۔۔۔۔ خود کدھر ہیں۔۔۔۔۔

نیوز رپورٹر کے لہجے میں طنز تھا اور وہ بات کو بڑھا چڑھا کے پیش کر رہی تھی

الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔۔۔۔۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور زریں پاش اندر آئی۔۔۔۔۔ وہاج کی اڑی اڑی رنگت۔۔۔۔۔ دیکھ کے وہ

دھک سے رہ گئی۔۔۔۔۔

”وہاج کیا ہوا ہے آپ کیوں ایسے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔“ ”کوئی میسج لے تو نہیں ہو گیا۔۔۔۔۔“

وہ اس کے قریب آ کے فکر مند انہ لہجے میں بولی۔۔۔۔۔

اس کا موبائی ل مسلسل بج رہا تھا
اس نے نظر اٹھا کے زرباش کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔
اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ زرباش دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔۔
”تم ہو مسئی لہ۔۔۔۔۔؟“
وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ۔۔۔۔۔ کے درو دیوار لرز اٹھے
وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔۔
اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔۔۔۔۔
”تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“
اس نے ٹیبل پہ پڑا۔۔۔۔۔ گلدان۔۔۔۔۔ ٹی وی پہ دے مارا۔۔۔۔۔
وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔۔۔۔۔
اس کی یہ حالت زرباش کی سمجھ سے بالاتر تھی۔۔۔۔۔

اس کا ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا تھا

وہ تڑپ کے اس طرف بڑھی۔۔۔۔

تو اس نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے دھکیلا۔۔۔۔

”میں نے کہا نا دفعہ ہو جاؤ۔۔۔۔

وہ پھر دھاڑا۔۔۔۔

لیکن اس دفعہ وہ سہمی نہیں۔۔۔۔ بلکہ ہمت کر کے۔۔۔۔ اس کے قریب گئی۔۔۔۔

اس نے کچھ اتنے زور سے اسے دھکا دیا کہ وہ کہنیوں کے بل زمین پہ جا کے لگی۔۔۔۔

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تھے۔۔۔۔

اس نے اسے بازو سے پکڑا اور۔۔۔۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے دروازہ سے باہر لے جا کے دروازہ اس

کے منہ پہ بند کر دیا

وہ وہی بیٹھ کے۔۔۔۔ دروازہ بجاتی رہی روتی رہی

اور اندر وہ دونوں ہاتھوں میں سر دے کے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔



بھلا دے مجھ کو بے وفائی ہی بجائے لیکن

گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں۔۔۔۔۔

جس وقت۔۔۔۔۔ وہ اس فارم ہاؤس کو چھوڑ کے باہر نکلی۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ سیاہ

اندھیرہ اس حسین وادی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔۔۔۔۔ صبح کی روشنی میں دلکش مناظر پیش

کرنے والی یہ وادی اس وقت ایک عجیب وحشت ناک سناٹے کے ساتھ۔۔۔۔۔ ایک عجیب سا

منظر پیش کر رہی تھی اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ وہ اس وقت سوات کے

کون سے علاقے میں موجود ہے۔۔۔۔۔ باہر بل کھاتی سڑکیں ویران پڑی تھیں۔۔۔۔۔

آسمان پہ گہرے بادلوں کا راج تھا جو برسنے کو بے تاب تھے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد۔۔۔۔۔ گرج

چمک کے ساتھ۔۔۔۔۔ آسمان پہ ایک لکیر نمودار ہوتی۔۔۔۔۔ تو زمین پہ تھوڑی روشنی

ہوتی۔۔۔۔۔ اور پھر علاقہ اندھیرے میں ڈوب جاتا۔۔۔۔۔ جب وہ فارم ہاؤس سے نکلی تھی
اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس وقت وہ چادر سے منہ چھپاتی تیز تیز قدم
بڑھاتی۔۔۔۔۔ آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔۔۔ سمجھ تو اسے اس وقت بھی نہیں آرہی
تھی۔۔۔۔۔ وہاں کے رویے کی وجہ سے اس کا دماغ سائی یں سائی یں کر رہا تھا دماغ ماؤف اور
آنکھیں رونے کی وجہ سے لال تھی۔۔۔۔۔ آنکھوں میں عجیب سے خوف کا عکس تھا۔۔۔۔۔
لیکن چوٹ اس دفعہ۔۔۔۔۔ اس کی عزت نفس پہ اتنی گہری تھی۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ جس
نے اس کی روح تک کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے بازو بری طرح زخمی
تھے۔۔۔۔۔ لیکن وہ اس ویران سڑک کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے اپنی
منزل کا نہیں پتہ تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ چلتی ہی جا رہی تھی۔۔۔۔۔
”دلوں سے دھتکارے ہوئے لوگوں کو یوں بھی منزلیں نہیں ملا کرتی وہ تمام عمریوں ہی بھٹکتے
رہتے ہیں۔۔۔۔۔“

بل کھاتی سڑک کے دائیوں طرف۔۔۔۔۔ لکڑی کے بنے۔۔۔۔۔ گھروں میں بتیاں روشن
تھی۔۔۔۔۔ یہ علاقہ اس ویران علاقے کی نسبت قدرے بہتر تھا۔۔۔۔۔
یہاں ادھر کی نسبت تھوڑی۔۔۔۔۔ روشنی تھی۔۔۔۔۔ مدہم روشنی میں وہاں لگے بورڈ پہ
۔۔۔۔۔ لکھی تحریر پہ وہ ٹھٹکی۔۔۔۔۔
”مالم جبہ۔۔۔۔۔ دس کلو میٹر۔۔۔۔۔“
یعنی وہ۔۔۔۔۔ مالم جبہ سے پیچھے تھی۔۔۔۔۔
وہاں نیچے۔۔۔۔۔ نیلا۔۔۔۔۔ پانی اس وقت۔۔۔۔۔ سیاہ معلوم ہو رہا تھا اوپر۔۔۔۔۔ پل اس
لمحے ویران تھا۔۔۔۔۔
اچانک آسمان پہ بجلی چمکی تو وہ سہم گئی۔۔۔۔۔
وہ جلد بازی میں نکل تو آئی تھی لیکن وہ آگے کا کچھ نہیں جانتی تھی۔۔۔۔۔

دوسری۔۔۔۔۔ طرف۔۔۔۔۔ کافی دیر دروازہ بختارہا۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلاتھا۔۔۔۔۔

کافی دیر ماؤف دماغ کے ساتھ وہ وہی بیٹھا رہا
اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ایسی حرکت آخر کر کون سکتا ہے۔۔۔۔۔
آہستہ آہستہ اس کا ذہن کڑیاں ملانے لگا تھا۔۔۔۔۔
اور پھر وہ اس انسان تک پہنچ گیا تھا۔۔۔۔۔
جو اس نکاح سے باخبر بھی تھا اور اس کا سب سے بڑا دشمن بھی۔۔۔۔۔
اس نے سختی سے نچلا ہونٹ دانتوں میں پیوست کیا
مٹھیاں بھینچ لی۔۔۔۔۔

اس کا دل چاہا اگر رانی اس کے سامنے ہو تو وہ اس کا قتل کر دے۔۔۔۔۔
معاف کرنے والے لوگوں۔۔۔۔۔ میں سے تو وہ یوں بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔

لیکن اس حد تک جذباتی بھی نہیں تھا کہ۔۔۔۔۔ دشمن کو باخبر کر دے۔۔۔۔۔

وہ آہستہ آہستہ پر سکون ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔ اور پہلا خیال ہی اسے زرپاش کا آیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے دروازہ بجانا کیوں بند کر دیا تھا۔۔۔۔۔؟“

وہ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔“

وہ جذبات میں اس کے ساتھ زیادتی کر چکا تھا۔۔۔۔۔ اس بات کا احساس اسے اب شدت سے

ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

کسی احساس کے تحت وہ اٹھا۔۔۔۔۔

دروازہ کھولا۔۔۔۔۔

باہر۔۔۔۔۔ بالکل ویرانی تھی

وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا تو ٹی وی لائونچ ویران پڑا تھا۔۔۔۔۔

باہر زور سے بجلی چمک رہی تھی۔۔۔۔۔

اس نے۔۔۔۔۔ نیچے کمروں میں دیکھا وہ کمروں میں بھی نہیں تھی۔۔۔

کچھ غلط ہونے کے احساس نے اسے اپنے شکنجے میں لینا شروع کر دیا تھا

آہستہ آہستہ۔۔۔۔۔ اس نے پورے فارم ہاؤس کو۔۔۔۔۔ چھان مارا تھا

بو اسے لے کے گھر کے ہر ملازم تک سے پوچھ لیا تھا

کوئی ی نہیں جانتا تھا وہ کدھر ہے۔۔۔۔۔

اس نے نظر گھما کے دیکھا۔۔۔۔۔ گھڑی رات کے آٹھ بج رہی تھی۔۔۔۔۔

رات کے اس پہر وہ کدھر جاسکتی تھی

کچھ سوچ کے وہ تیزی سے فارم ہاؤس سے باہر نکلا۔۔۔۔۔ گاڑی سٹارٹ کی۔۔۔۔۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔۔۔۔۔

وہ اس جگہ پہ بالکل انجان تھی۔۔۔۔۔

وہ کیسے اتنی بڑی حماقت کر سکتی تھی۔۔۔

”کہیں کچھ غلط نہ ہو گیا ہو۔۔۔۔۔

تیزی سے ویران سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کے ذہن میں طرح طرح کے دوسو سے
جنم لے رہے تھے

سڑکیں بالکل ویران تھی

کہیں بھی زرباش کا نام و نشان تک نہیں تھا۔۔۔۔۔

یہ بات اس کی تشویش میں اضافہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔

اگر وہ فارم ہاؤس سے نکلی تھی تو یقیناً اس نے اسی واحد سڑک کا انتخاب کیا ہو گا۔۔۔۔۔

وہ خود سے ہی ذہن میں تانے بانے جوڑنے لگا۔۔۔۔۔

ساتھ ہی۔۔۔۔۔ وہ اس طوفانی بارش میں تیزی سے گاڑی ڈرائی پور کر رہا تھا۔۔۔۔۔

اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا

اس سارے راستے میں وہ کوئی دسویں بار خود کو کوس چکا تھا۔۔۔۔۔

ساتھ ہی اس کی سلامتی کی دعائی یں بھی مانگ رہا تھا
پانچ منٹ میں وہ اس کے ہوش اڑا چکی تھی۔۔۔۔۔
وہ بل کھاتی سڑک کر اس کر کے آگے بڑھا تو سامنے مالم جبہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔
اس نے جیسے ہی گاڑی نیچے کی طرف بڑھائی
نیچے پل کے قریب پتھریلی روش پہ اسے۔۔۔۔۔ کوئی ی تیزی سے چلتا ہوا دیکھائی
دیا۔۔۔۔۔

اندھیرے میں وہ سایہ سا معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔۔
لیکن اگلے ہی لمحے وہ پہچان گیا تھا۔۔۔۔۔
گاڑی وہی روک کے وہ تیزی سے اس طرف بڑھا تھا۔۔۔۔۔
وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس طرف بڑھا تھا
وہ اب پل کے اوپر چڑھ چکی تھی۔۔۔۔۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔۔۔۔

”زری۔۔۔۔“

وہ چیخا تھا۔۔۔۔

اس کے دل کی دھڑکن رک گئی تھی سانس کہیں حلق میں ہی اٹک گیا تھا لیکن اس کی رفتار
میں کمی نہیں آئی تھی

تو کیا وہ واقعی ہی اس کے پیچھے آگیا تھا۔۔۔۔

”وہ اتنی ضروری کب سے ہو گئی تھی۔۔۔۔“

”زری پاش رک جاؤ میں جانتا ہوں وہ تم ہی ہو۔۔۔۔“

وہ بھاگتے ہوئے تقریباً التجا کر رہا تھا۔۔۔۔

اس نے پلٹ کے نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔

ہاں اس کے قدم تھوڑے سست ہوئے تھے۔۔۔۔

وہ پل کے قریب پہنچ گیا تھا اور مسلسل اسے پکار رہا تھا
لکڑی کا پل ہلکا سا لرزاتا تھا اور آواز بھی قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔
”زری۔“

بالکل قریب آ کے اس نے بازو سے پکڑ کے اسے اپنی طرف موڑ لیا تھا۔۔۔۔
گھروں کے باہر لگے بلب کی مدہم روشنی میں وہ اسے پہچان چکا تھا
جو بری طرح بھیگ چکی تھی۔۔۔۔

اس نے ایک زخمی نگاہ اس پہ ڈالی
جو بہت بری طرح بھیگ چکا تھا اور پانی اب اس کے سر کے بالوں سے بھی ٹپک رہا تھا
وہ دونوں اس وقت گھرے سمندر کے اوپر بنے لکڑی کے پل پہ کھڑے تھے
”رک جاؤ خدا کے لیے۔۔۔۔“

اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ التجا کی تھی۔۔۔۔

اس نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی
حالانکہ وہ بری طرح زخمی تھا اور اس طرح پکڑنے پہ اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی
لیکن اس وقت اندر کی تکلیف اس پہ غالب آچکی تھی۔۔۔۔۔
”کیا کچھ کسر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔“ جو کہنے آپ یہاں آئے ہیں۔۔۔۔۔؟
اس نے پہلی دفعہ۔۔۔۔۔ طنزیہ لہجے میں بات کی تھی۔۔۔۔۔
”تم یہاں کیوں آگئی ہو۔۔۔۔۔؟“
اس نے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔
شکست خورہ لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔
”آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے۔۔۔۔۔“
اس نے سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔
”میں اس وقت اپنی حواسوں میں نہیں تھا۔۔۔۔۔“

اس نے کمزور سی صفائی دی۔۔۔۔۔

”بس کر دیں مسٹر وہاج خان۔۔۔۔۔ یہ آپ نے خوب کہی کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں
تھا۔۔۔۔۔ آنکھیں کھول کے دیکھیئے یہ جو سامنے آپ کے کھڑی ہے۔۔۔۔۔ ایک عورت
ہے جو جذبات بھی رکھتی ہے اور احساسات بھی۔۔۔۔۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔۔۔۔۔“
اس نے تیزی سے اپنا بازو چھڑوایا اور قدرے اونچی آواز میں ایک ایک لفظ پہ زور دے کے
بولی۔۔۔۔۔

جسے جب چاہا۔۔۔۔۔ اٹھا کے سر پہ بٹھالیا اور پھر زمین پہ پٹھ دیا۔۔۔۔۔ جسے جب چاہا بستر کی
زینت بنالیا۔۔۔۔۔ اور جب چاہا دھتکار کے گھر سے باہر پھینک دیا۔۔۔۔۔ جس سے اپنی انا
کی تسکین کے لیے نکاح کر لیا اور پھر طلاق کا تمنغہ سجا دیا۔۔۔۔۔
وہ جیسے پھٹ پڑی تھی

وہ سر جھکائے بس خاموشی سے اسے سن رہا تھا

جو آج ایک زخمی شیرنی لگ رہی تھی۔۔۔۔

”مانا مرد ہیں آپ رتبہ بڑا ہے آپ کا۔۔۔۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ طاقت کے نشے میں چور ہو کے فرعون بن بیٹھیں۔۔۔۔۔“

وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کے اسے آئی بنہ دیکھا رہی تھی۔۔۔۔۔

”معذرت وہاج خان۔۔۔۔۔ انسان محبت کے بغیر تو جی سکتا ہے لیکن عزت کے بغیر نہیں جی سکتا۔۔۔۔۔“

وہ غصے میں نہیں تھی

لیکن وہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔

اس لیے اسے آئی بنہ دیکھا رہی تھی۔۔۔۔۔

”آپ نہ کریں محبت کون کہتا ہے محبت کریں۔۔۔۔۔ لیکن عورت کو حقیر چیز تو نہ سمجھیں۔۔۔۔۔“ عورت کو عورت تو سمجھیں۔۔۔۔۔ دل بہلانے کی چیز تو نہیں ہے۔۔۔۔۔“ یا کوئی ی۔۔۔۔۔ آل ٹائی م سروسز فراہم کرنے والی ملازمہ۔۔۔۔۔“

اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا

”لیکن ایک منٹ۔۔۔۔۔ غلطی آپ کی نہیں ہم جیسی عورتوں کی ہے جو ایسے ویسے مرد سے وفا کی امید رکھ لیتی ہیں۔۔۔۔۔“

”وفا کوئی اتنا حقیر جذبہ بھی نہیں ہے کہ یہ آسانی سے ہر کسی کے پاس دستیاب ہو۔۔۔۔۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اسے بہت کچھ جتاگئی تھی اس نے پہلی بار سراٹھایا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کیا مجھے نہیں رکھیں گے ساتھ میں خود آپ جیسے مرد کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔۔۔۔۔“ وہ کیا خاک مرد ہو جو ایک عورت کا ہو کے نہ رہ سکے جو ایک عورت کو دنیا کے

سامنے قبول کرنے کی جرات نہ رکھتا ہو۔۔۔۔۔ جو ایک عورت کو تحفظ نہ دے سکتا
ہو۔۔۔۔۔ اور جو عورت کی عزت نہ کر سکتا ہو دنیا سے چاہے جو بھی کہے میں اسے ایک مرد
کہہ کے۔۔۔۔۔ اس جنس کی تذلیل نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔“
اس نے بڑے آرام سے۔۔۔۔۔ تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔
”میں چاہتی ہوں آپ یہی کھڑے کھڑے مجھے طلاق دے دیں۔۔۔۔۔“
اس کے اجنبی لہجے میں کہے گئے اگلے حکم نامے پہ اس نے تڑپ کے سراٹھایا تھا
جو رخ موڑ کے دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔۔۔۔۔
اس نے اسے شانوں سے پکڑ کے اپنی طرف موڑا تھا۔۔۔۔۔
”تم ہر جگہ ٹھیک ہو میں ہر جگہ غلط ہوں۔۔۔۔۔ مانتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ بے وفائوں
کے لیے سزا کا تعین بھی ان کی بے وفائی کو دیکھ کے کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ تم اپنے دل پہ ہاتھ
رکھ کے کہو اگر تم نے مجھے واقعی ہی۔۔۔۔۔ سو فیصد بے

وفا پایا ہے اپنے حق میں تو مجھے یہ سزا قبول ہے۔۔۔۔۔“

اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔۔۔۔۔

بارش کی رفتار اب قدرے سست تھی۔۔۔۔۔

وہ اپنے آپ سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی کہ واقعی ہی اس نے اسے زندگی میں کم ہی بے

وفا پایا تھا۔۔۔۔۔

وہ چھوڑنے کی بات کرتا تھا لیکن چھوڑ کے نہیں جاتا تھا۔۔۔۔۔

وہ اسے بغیر جتائے تحفظ دیتا تھا۔۔۔۔۔

”میں ایک عورت کو دنیا کے سامنے قبول کرنے کی بھی جرأت رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ میں ایک

عورت کو تحفظ بھی دے سکتا ہوں اور اس کی عزت بھی کر سکتا ہوں اور یہ سب میں تمہیں کر

کے دیکھاؤں گا۔۔۔۔۔ تم مجھے تھوڑا وقت دے کے دیکھو۔۔۔۔۔“

وہ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے ادا کر کے ایک عزم سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ اس کی آنکھوں سے چھلکتی سچائی کی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”مرد اتنا بھی اچھا نہیں ہوتا جتنا عورت گمان کر لیتی ہے۔۔۔۔۔ اور اتنا برا بھی نہیں ہوتا جتنا وہ سمجھ لیتی ہے۔۔۔“

”میں یہاں اس جگہ کھڑے ہو کے تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہاری کھوئی ہوئی عزت تمہارا کھویا ہوا مان سب لٹا دوں گا۔۔۔۔۔“ لیکن یوں چھوڑ کے مت جاؤ مجھے۔۔۔۔۔“

اس نے دعویٰ کرتے ہوئے التجا بھی کی تھی۔۔۔۔۔

”محبت میں چھوڑ کے جانے والے۔۔۔۔۔ بے وفا کہلائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ نظر بھی بے وفا چراتے ہیں با وفا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔۔۔۔۔

”تم ہاتھ چھڑا کے جانا چاہو گی تو میں ہاتھ چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ کیونکہ میں مرد ہوں تمہارے جیسا حوصلہ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ ایک دفعہ دھتکارا جاؤ تو محبت سے بھی مکر جاتا ہوں۔۔۔۔۔“

وہ آہستہ آواز میں اس کے سارے وسوسے خدشات دور کرنے کی شعوری کوشش کر رہا تھا
”میں اگر محبت کے کانسیٹ کو نہیں مانتا تو میں بے وفائی کے کانسیٹ کو بھی نہیں مانتا
-----“

جب محبت کی ہی نہیں تو انسان بے وفائی کیا خاک کرے گا۔۔۔۔۔
”بے وفائی کرنے کے لیے بھی پہلے محبت کی جاتی ہے۔۔۔۔۔“

اس لحاظ سے تو مرد بے وفانہ ہوا۔۔۔۔۔

”میں تمہیں چھوڑ بھی دوں گا تو۔۔۔۔۔ مجھ پہ یہ الزام نہیں لگے گا۔۔۔۔۔ لیکن تم چھوڑ دو
گی تو تم پہ یہ الزام بھی لگے گا۔۔۔۔۔“

وہ اتنی آسانی سے اسے بتا چکا تھا کہ وہ اس کے جذبے سے باخبر ہے اس نے فوراً نظریں
چرائی۔۔۔۔۔

”چھوڑ جانے کے لیے بھی ہمت چاہیئے ہوتی ہے۔۔۔۔۔“ جیسے موت آسان نہیں ہوتی
ویسے چھوڑ جانا بھی آسان نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میں کسی رشتے میں بھی زبردستی کا قائل نہیں
ہوں۔۔۔۔۔ اگر تم مجھے ابھی کہو تمہیں چھوڑ دوں۔۔۔۔۔ ”تو میں انکار نہیں کروں گا لیکن تم
سے صبح تک کی مہلت ضرور مانگوں گا۔۔۔۔۔“ کیونکہ میں تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کے نہیں
جاسکتا۔۔۔۔۔

اپنے ہاتھوں کو اس کے کندھوں سے ہٹاتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔۔۔۔۔
اس نے تڑپ کے اس کی طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔
”اگر آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے تو۔۔۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ کے۔۔۔۔۔ جانے میں کیا
مسئلہ ہے۔۔۔۔۔“

وہ جل کر بولی تھی۔۔۔۔۔

”تم میری بیوی ہو اور یہ محبت سے بڑا حوالہ ہے۔۔۔۔۔“

وہ گفتگو میں پہلی بار مسکرایا تھا۔۔۔۔۔

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ صبح تک ٹھنڈی دماغ سے سوچ بھی لو۔۔۔۔۔ اگر تمہیں واقعی ہی لگتا ہے میں تمہیں تحفظ نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔ تو مجھے بتا دینا۔۔۔۔۔ میں تم پہ زبردستی نہیں کروں گا۔۔۔“

اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے ہاتھ سے پکڑا۔۔۔۔۔ اور ساتھ لے کے جانے لگا

اس نے اس بار مذاحت نہیں کی تھی

چپ چاپ گاڑی میں بیٹھی رہی تھی۔۔

سارے راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔۔۔

بارش پوری طرح رک چکی تھی۔۔۔

وہ اسے لے کے فارم ہاؤس کے اندر بڑھا تو بوابے تابلی سے آگے بڑھی۔۔۔۔۔

اور زرباش اور وہاج سے سوال پوچھنے لگی۔۔۔۔۔

جس کا مختصر جواب دے کے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔۔۔۔۔
”پیچھے زرپاش انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔۔۔۔۔
اور پھر کپڑے بدل کے۔۔۔۔۔ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔۔۔
وہ جس وقت کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔۔۔ وہ اس وقت بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے
آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔
وہ بھی چپ چاپ بیڈ پہ ہی ٹک گئی۔۔۔۔۔
اسی لمحے کھانا بوا کمرے میں ہی لے آئی تھی
وہاں نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔۔۔۔۔
بوا کے جانے کے بعد وہ دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔۔۔۔۔
”وہاں کھانا کھالیں۔۔۔۔۔“
اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پہ جمی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”مجھے بھوک نہیں ہیں تم کھا لو۔۔۔۔۔“

اس نے اسی طرح آنکھیں موندے ہوئے کہا تھا وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔۔۔۔۔
اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا پتہ نہیں وہ اس وقت کس پریشانی کا شکار تھا اوپر سے میں
بھی۔۔۔۔۔

”سردبادوں آپ کا۔۔۔۔۔“

کچھ سوچ کے اس نے ہچکچاتے ہوئے اگلی بات کہی تو اس نے فٹ سے آنکھیں کھولی۔۔۔۔۔

”کیوں عادتیں خراب کرتی ہو میری۔۔۔۔۔“

وہ دکھ سے مسکرایا تو اسے لاجواب کر گیا۔۔۔۔۔

”اگر آپ کہیں تو روز دبا دیا کروں گی۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکا کے معصومیت سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”پر محترمہ آپ تو جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔۔۔۔۔؟“

اس نے اس کے معصوم چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”ہم اپنا ارادہ بدل چکے ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے آہستہ آواز میں اسے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔

”اتنی جلدی۔۔۔۔۔؟“

اس کی زبان سے پھسلا تھا۔۔۔۔۔

اس نے ماتھے پہ بل ڈال کے اسے دیکھا تھا

جو نچلا لب دانتوں تلے دبائے مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ آپ کیا چاہتے ہیں چلے جائیں ہم۔۔۔۔۔“

اس نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔“

وہ انجان بنا۔۔۔۔۔

”اسی لمحے اس کی نظر----- اس کی زخمی بازو پہ ٹک گئی تو آگے بڑھ کے جلدی سے اس

کا بازو اپنی گود میں رکھا۔۔۔۔۔“

”یہ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ فکر مندی سے گویا ہوا۔۔۔۔۔

”آپ کی مہربانی ہے۔۔۔۔۔“

اس نے ناراضگی سے کہا۔۔۔۔۔

تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

اب وہ الماری سے فرسٹ ایڈ باکس نکال رہا تھا

پھر وہ فرسٹ ایڈ باکس لے کے اس کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا

اس کا بازو گود میں رکھ کے اب وہ اس کا زخم صاف کر رہا تھا۔۔۔۔۔

”ویسے ہم تو اور بھی بہت سی مہربانیاں کرنا چاہتے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔۔۔“

اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔۔۔۔

تو وہ جھپ گئی۔۔۔۔

وہ اب پاؤں ڈین ڈال رہا تھا۔۔۔۔

اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔۔۔۔

”بہت نازک نہیں ہیں آپ۔۔۔۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔

اور ساتھ ہی پٹی کرنے لگا۔۔۔۔

اس سے نظر بچا کے وہ بھی مسکرا دی۔۔۔۔

”مرد اظہارِ محبت میں یوں بھی کنجوس ہوتا ہے۔۔۔۔ عورت اپنی نگاہ سے اس کی محبت جانچنے

کا ہنر رکھتی ہے۔۔۔۔“



کیا اتنی سستی تھی وفا میری۔۔۔۔۔

کہ تیرے پاؤں کے نیچے روندھ دی گئی۔۔۔۔۔

سورج پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا تھا اس کے باوجود یہاں کی ہوائی یں ٹھنڈی
تھی ملکہ کو ہسار میں ان دنوں بھی سیاخوں کا رش تھا۔۔۔۔۔ جس کی وجہ سے سڑکوں پہ کافی
رش تھی۔۔۔۔۔ ایک تو گرمی اوپر سے چھٹیاں۔۔۔۔۔ ساری خلقت جیسی اسی طرف آنکلی
تھی۔۔۔۔۔

ایسے میں۔۔۔۔۔ اس پتھروں سے بنے گھر میں عجیب سی سرد مہری تھی۔۔۔۔۔
آہستہ آہستہ چلتے پنکھے کے نیچے۔۔۔۔۔ کھڑی۔۔۔۔۔ زخمی نظروں سے انہیں گھور رہی
تھی۔۔۔۔۔

”کس سے پوچھ کے تم نے میری ڈائی ری کو ہاتھ لگایا ہے۔۔۔۔۔“

وہ اس پر چلائے تھے

جو کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی۔۔۔۔۔

”میں نے صرف اس پہ نظم لکھنے کی غرض سے اٹھائی ہے شہباز۔۔۔۔۔“

اس نے کمزور سی صفائی دی۔۔۔۔۔

”شٹ اپ یو باسٹرڈ۔۔۔۔۔“

وہ اس پہ بری طرح چلائے تھے۔۔۔۔۔

اسے تو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی اس سے اتنی بڑی کیا غلطی ہوگئی ہے لیکن جس سے ہم گریز

پاہو اس کی چھوٹی سی غلطی بھی بہت بڑی لگتی ہے۔۔۔۔۔

”لاکھ دفعہ منع کیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔ میری۔۔۔۔۔ چیزوں پہ اپنا منحوس سایہ مت ڈالا

کرو۔۔۔۔۔“

انہوں نے ڈائی ری کو زور سے ٹیبل پہ پٹختا

اسے اب اس شخص کے اس رویے کا عادی ہو جانا چاہیئے تھا ان سات مہینوں میں اس نے۔۔۔۔۔ اس کی گالیوں جھڑکیوں اور ماتھے کے بل کے علاوہ دیکھا ہی کیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ہر دفعہ اس شخص کا رویہ اسے نئے سرے سے تکلیف دیتا تھا۔۔۔۔۔ اسے تو یہ سمجھ نہیں آتی تھی

”یہ بندہ اس سے اتنی خار کیوں کھاتا تھا۔۔۔۔۔“

”کیا آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

اس کے لہجے میں عجیب سی چھبسن تھی۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کرخت آتی ہے تم سے۔۔۔۔۔ تمہاری ان آنکھوں سے۔۔۔۔۔ تمہارے ان ہاتھوں سے۔۔۔۔۔“

اس نے قریب آ کے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بغیر کوئی لحاظ کیے۔۔۔۔۔ ایک ایک لفظ اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔۔۔۔۔

ان الفاظوں نے جیسے اسے پاگل کر دیا تھا۔۔۔۔۔

وہ بیگ میں سامان ڈال کے جانے کو تیار تھا

جب اس نے اس کا بازو پکڑ کے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔۔۔۔۔

”اچھا اب کرخت آتی ہے آپ کو عورت کو استعمال کرتے وقت تو کالی اور سفید کا فرق بھول

جاتے ہیں آپ مرد۔۔۔۔۔ بیوی بناتے ہوئے کرخت آتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ بھی سارے لحاظ پس و پشت ڈالتے ہوئے پھٹ پڑی تھی۔۔۔۔۔

”شٹ اپ۔۔۔۔۔ گٹ لاسٹ۔۔۔۔۔“

اہمیت نہ دیتے ہوئے اس نے۔۔۔۔۔ اپنا بازو چھڑوایا۔۔۔۔۔

اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔۔

”میرا آج سے کوئی تعلق نہیں ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔“

اس نے دروازے پہ جا کے پلٹ کے نخوت سے اسے آگاہ کیا۔۔۔۔۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں شہباز یہ مت بھولیں میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں آپ نہیں نام دیں گے اسے تو میں کیا منہ دیکھاؤں گی دنیا کو۔۔۔۔۔“ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔۔۔۔۔ بھلے مجھ سے محبت نہ کریں لیکن یہ ظلم نہ کریں۔۔۔۔۔“

اس نے روتے ہوئے اس کے پیر پکڑ لیے تھے۔۔۔۔۔

”تم میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو۔۔۔۔۔ بلکہ یہ شادی ہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی میں اس زبردستی کے رشتے کو مزید نہیں چلا سکتا۔۔۔۔۔ اور رہی بات تمہاری بیٹی کی تو مجھے اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ تم سے بھی زیادہ بد صورت ہوگی۔۔۔۔۔“

اس کے چہرے کو سختی سے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے نفرت سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”میں شہباز خان۔۔۔۔۔ ماہ جبین تمہیں اپنے ہوش و حواس میں طلاق دیتا ہوں۔۔۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔۔۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔۔۔۔۔“

وہ تین لفظوں کا تحفہ اس کے منہ پہ مار کے۔۔۔۔۔ اسے ٹھوکر مار کے چلا گیا تھا۔۔۔۔۔

وہ پتھر کی بت بنی وہی بیٹھی رہی۔۔۔۔۔

جیسے اسے رشتہ جڑنے کا یقین نہیں آیا تھا ویسے ہی اسے رشتہ ٹوٹنے کا بھی یقین نہیں آ رہا

تھا۔۔۔۔۔

وہ بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ قافلہ لگ رہی تھی جسے نکاح کے نام پہ لوٹا گیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے خالی خالی آنکھوں سے آخری بار اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

اور ماؤف دماغ کے ساتھ آخری بار۔۔۔۔۔ اس کی گاڑی کی آواز سنی تھی۔۔۔۔۔

”پہلی بار اس کی گاڑی کی آواز سن کے دل نے اس کو پانے کی خواہش کی تھی“

اور آج دل نے اس کی واپسی کی تمنا بھی نہیں کی تھی۔۔۔۔۔

وہ سات ماہ اسے ذہنی جسمانی۔۔۔۔۔ تشدد دیتا رہا۔۔۔۔۔ وہ تب۔۔۔۔۔ بھی دل سے نہیں

اترا تھا۔۔۔۔۔

آج چھوڑ کے جانے کے بعد کیسے اترتا۔۔۔۔۔
ہاں لیکن اس نے ایک بددعا سے ضرور دی تھی۔۔۔
”خدا کرے شہباز خان۔۔۔۔۔ تمہیں محبت ہو جائے۔۔۔۔۔“
خدا کے لیے تو وہ بندی تھی اس کی ایسا ممکن تھا کہ وہ نہ سنتا۔۔۔۔۔
شہباز نے جانے سے پہلے ایک الوداعی نگاہ اس پتھروں سے بنے گھر پہ ڈالی تھی
اس کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کے۔۔۔۔۔ وہ گاڑی بھگالے گیا تھا۔۔۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ اب روز اس نے ادھر آنا ہے۔۔۔۔۔



لوگوں نے اس کو میری محبت سمجھ لیا
محسن وہ مجھے جان سے پیارا تھا بس

بڑی حویلی میں پچھلے دور وز سے۔۔۔۔۔ گھمبیر خاموشی کا راج تھا۔۔۔۔۔ میر داد خان کمرے سے کم ہی نکلتے تھے۔۔۔۔۔ اور رجب خان اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے خبر رکوانے کے ساتھ ہی ساتھ وہاج کو ڈھونڈنے کی بھی کوشش کر رہے تھے جس کا نمبر پاورڈ آف آرہا تھا گھر کی خواتین نے مصلحتاً چپ سادھ رکھی تھی۔۔۔۔۔

اس وقت بھی۔۔۔۔۔ کسی کے ذور ذور سے دروازہ کھٹکھٹانے پہ میر دار نے جھنجھلا کے دروازہ کھولا تھا۔۔۔۔۔

سامنے مہر النساء کھڑی تھی جس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”باباجان وہاج میڈیا پہ آگیا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اطلاع دی تھی۔۔۔

تو وہ تیزی کے ساتھ ٹی وی لائونچ کی طرف بڑھے تھے۔۔۔

سامنے بڑی اسکرین پہ۔۔۔۔۔ وہ کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے پر سکون سا بیٹھا تھا

سامنے ایک ٹی وی اینکر بھی موجود تھا۔۔۔۔۔

شہباز خان بھی صوفے پہ مزے سے بیٹھے غصہ ضبط کرتے رجب خان کی حالت سے مزہ لوٹ رہے تھے

میرداد کی نظریں اسکرین پہ جمی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں۔۔۔۔۔ کہ آج کل وہاج خان کے خفیہ نکاح کی

خبریں۔۔۔۔۔ پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔“ تو ہم نے سوچا کیوں نہ ان

حقائق سے پردہ اٹھایا جائے اس لیے۔۔۔۔۔ ہر لمحہ باخبر۔۔۔۔۔ نے وہاج خان کو اپنے شوپہ

دعوت دی ہے۔۔۔۔۔“

نیوز اینکر نے۔۔۔۔۔ مسکراتے ہوئے وہاج پہ ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پروگرام کا آغاز کیا

تھا۔۔۔۔۔

”جی تو وہاج خان۔۔۔۔۔ آپ کی شادی کی خبروں میں کتنی سچائی ہے۔۔۔۔۔“

وہ وہاں کی طرف متوجہ ہوا

سب کی سماعتیں۔۔۔۔۔ اس کا جواب سننے کو بے تاب تھی

حویلی میں سب دم سادھے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔

”سو فیصد۔۔۔۔۔“

اس نے مطمئن یں سے انداز میں جواب دیا تو۔۔۔۔۔ میرا دواہی صوفے پہ ڈھ

گئے۔۔۔۔۔

البتہ۔۔۔۔۔ رجب خان کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔۔۔۔۔

”یعنی آپ نے واقعی نکاح کر رکھا ہے۔۔۔۔۔؟“

نیوز رپورٹر نے تصدیق چاہی۔۔۔۔۔

اس میں حیران کن کیا بات ہے۔۔۔۔۔ کیا میں پہلا مرد ہوں جس نے نکاح کیا

ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک ابرواٹھا کے بولا۔۔۔۔۔

”حیران کن بات۔۔۔۔۔ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ خان خاندان۔۔۔۔۔ کے چشم و چراغ

نے۔۔۔۔۔ ایک رقاہ سے شادی کر لی۔۔۔۔۔

دور وادیوں میں بیٹھی زرپاش کی سماعتوں پہ اینکر کے یہ الفاظ کسی بم کی طرح گرے۔۔۔۔۔

”پہلی بات میری بیوی رقاہ نہیں ہے۔۔۔۔۔“ اور اگر آپ کے ٹی وی چینل

نے۔۔۔۔۔ ایک اور دفعہ اس کے لیے رقاہ کا لفظ استعمال کیا تو اس کی کافی بھاری قیمت

چکانے پڑے گی آپ کے چینل کو۔۔۔۔۔“

اس کے سختی سے وارن کرنے پہ جہاں اینکر گڑبڑا کے بات سنبھالنے لگا تھا۔۔۔۔۔

وہی رجب خان کی رگیں غصے سے تن گئی تھی۔۔۔۔۔ میرداد بس اسکرین کو دیکھ کے رہ

گئے تھے۔۔۔۔۔

مہر النساء نے کھنکھنیوں سے پہلے اپنے ساتھ بیٹھی رضیہ کو دیکھا تھا جس کے چہرے پہ کوئی
تاثر نہیں تھا اور پھر شہباز خان کو جن کے لبوں پہ ایک دل جلا دینے والی مسکان تھی
وہی دور زرپاش کے دل سے جیسے وزنی بوجھ ہٹ گیا تھا
وہ واقعی ہی اسے تحفظ دینا جانتا تھا۔۔۔۔۔

”تو کیا آپ کی بیوی کے بارے میں غلط گائیڈ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔؟“
اینکرنے اگلا سوال داغا۔۔۔۔۔

”اگر آپ کسی کے انتقام کا نشانہ بن جائے تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔“
اس نے مسکرا کے کندھے اچکا دیئے۔۔۔۔۔

ٹی وی اسکرین پہ نظریں جما کے بیٹھی رانی کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔۔۔۔۔
”پھر آپ نے اپنے نکاح کو خفیہ کیوں رکھا۔۔۔۔۔؟“

اینکرنے اپنے مخصوص انداز میں اگلا سوال پوچھا تھا

”میں اس کے علاوہ بھی اپنی بہت سی باتیں میڈیا سے خفیہ رکھتا ہوں مجھے اپنی ذاتیات میں عمل دخل پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں اپنی بیوی کو اتنا سستا سمجھتا ہوں کہ اسے ہر ایک سے انٹرڈیوز کروایا جائے۔۔۔۔۔“ میرے لیے وہ بہت قابل عزت ہے“

وہ بہت مہارت سے ہر بات سنبھال رہا تھا۔۔۔۔۔

رجب خان کی آنکھیں آگ اگل رہی تھی۔۔۔۔۔

اور زرباش کا دماغ تھوڑا تھوڑا کام کرنے لگا تھا کل کارویہ بے وجہ نہیں تھا وہ دونوں ضرور کسی بڑی سازش کا شکار ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔

”اور میرے نزدیک۔۔۔۔۔ شوہروں میں کم از کم اتنی غیرت تو ہونی چاہیئے کہ۔۔۔۔۔ وہ

اپنی بیوی کو اتنا عام نہ کر دے کہ ہر عام شخص ان تک رسائی کر لے۔۔۔۔۔ میں نے نکاح

چھپایا ہی کب تھا۔۔۔۔۔ نہ میں خود چھپا تھا۔۔۔۔۔ میں تو اپنی بیوی کے ساتھ پچھلے ایک مہینے

سے سوات میں تھا۔۔۔۔۔ میں اپنی شادی کے ابتدائی دن انجوائے کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا

اس کے اعتماد میں ایک فیصد بھی کمی نہیں آئی تھی۔۔۔۔۔

”لیکن لوگ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کی بیوی کا بیک گر او نڈ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔“

اینکر۔۔۔۔۔ نے مزے لیتے ہوئے اگلا سوال پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”بیک گر او نڈ تو شاید۔۔۔۔۔ آپ کا بھی ٹھیک نہ ہو۔۔۔۔۔ لیکن اس کے لیے یہ حوالہ کافی

ہے کہ وہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔“ آپ کی بیوی کو ڈسکس کیا جائے تو آپ کو برا نہیں لگے

گا؟“ بہتر ہے بات مجھ تک رکھی جائے اور اسے ڈسکس نہ کیا جائے۔۔۔۔۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سخت ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

”لیکن آپ کو اناؤس کرنا چاہیئے تھا۔۔۔۔۔“

اینکر نے مشورہ دیا۔۔۔۔۔

”یہ اناؤس کرنے والا کام آپ لوگوں پہ چھوڑتا ہوں روزی روٹی چلتی ہے آپ کی اس

پہ۔۔۔۔۔“

وہ مسکراتے ہوئے طنز کر گیا تھا۔۔۔۔۔

”اور میرا خیال ہے اب یہ لوگوں کی فضول کی دلچسپی اور تجسس ختم ہو گیا ہو گا اور دوبارہ میری

گھریلو زندگی کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا کے کہتا اپنی بات ختم کر چکا تھا

”زرپاش کافی مطمئن دیکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔

اس کے لبوں پہ تفاخر بھری مسکراہٹ تھی۔۔۔۔۔

رجب خان نے۔۔۔۔۔ غصے سے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ زمین پہ دے مارا تھا۔۔۔۔۔

اور رانی جیت کے بعد بھی ہارنے پہ کف افسوس مل رہی تھی

وہ وہاں جہاں تھا

اسے ہاری ہوئی بازی جیتنے کا فن آتا تھا
گھومنے نکلاتو بھیڑ تھی
سوچنے بیٹھا تو تنہا رہ گیا
عمر کتنی منزلیں طے کر گئی
دل جہاں ٹھہرا تھا ٹھہرا رہ گیا

اندھیرے کے سیاہ ہیولے۔۔۔۔۔ پہاڑوں کے قریب محور قص تھے۔۔۔۔۔ اونچے قد
آور۔۔۔۔۔ درخت۔۔۔۔۔ جن کی چوٹیوں سے لڑکتی۔۔۔۔۔ مٹی پہ۔۔۔۔۔ عجیب سی
وحشت تھی۔۔۔۔۔ وہ دور سے اتنے حسین لگتے تھے کہ۔۔۔۔۔ اس نے پاس جانے کی کبھی
کوشش نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔۔۔۔۔ جو چیزیں دور سے خوبصورت
لگیں۔۔۔۔۔ ان کی گہرائی میں جا کے ان کی بد صورتی کو جانچنے کی کوشش نہیں کرنی
چاہیئے۔۔۔۔۔

پتھروں سے بنے چھت کے۔۔۔۔۔ اس اونچے سے ٹیرس پہ کھڑے ہو کے۔۔۔۔۔ دور
خلاؤں میں کچھ کھوجتے۔۔۔۔۔ وہ عجیب بے جان سی کھڑی تھی۔۔۔۔۔

گزشتہ برف باری کا سلسلہ رک گیا تھا پر تاحدِ نگاہ اندھیرہ پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ کہیں دور سفید
روشنیاں بہت غور سے دیکھنے پہ دیکھائی دیتی تھی۔۔۔۔۔ شاید وہ ملکہ کوہسار کا کشمیر پوائی نٹ
تھایا مال روڈ۔۔۔۔۔

”سب کو ملکہ کوہسار۔۔۔۔۔ حسین لگتا تھا ایک صحت آفرزا

مقام۔۔۔۔۔“ لیکن۔۔۔۔۔ کوئی بھی ان پہاڑوں کے گرد رقص کرتی کہانیاں نہیں
جانتا تھا۔۔۔۔۔ بہار کے موسم میں۔۔۔۔۔ جب ہر طرف پھول کھلتے تھے اسی لمحے
شاید۔۔۔۔۔ کوئی۔۔۔۔۔ چمن پورا اجڑ جاتا تھا۔۔۔۔۔ اور سخت گرمی میں جب ہوائیں چلتی
تھی تو کسی کا وجود بھی راکھ بن کے ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔ یا خزاں کے پتوں کے
ساتھ کسی کا دل قدموں کے نیچے روند دیا جاتا تھا۔۔۔۔۔ یاد سمبر کی اس برف باری

میں۔۔۔۔۔ کسی کی لاش دفن کی جاتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن یہاں کون جانتا تھا۔۔۔۔۔ ملکہ
کو ہسار میں کتنی کہانیاں دفن ہیں۔۔۔۔۔“

اسے یہاں ٹیرس کی ٹھنڈی سٹیل کی گرل کو پکڑ کے کھڑے ہوئے کوئی ایک بیس منٹ سے
زیادہ وقت گزر گیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ بغیر پلک جھپکائے۔۔۔۔۔ نگاہیں۔۔۔۔۔ ان
اندھیرے میں ڈوبے پہاڑوں پہ جمائے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ اب تو اس کی آنکھیں بھی شل ہو
گئی تھی۔۔۔۔۔

”لیکن احساسات کیوں شل نہیں ہوتے۔۔۔۔۔“

اس کے جانے کے بعد اسے اتنا یاد رہا تھا کہ ساتھ والے گھر سے اس کی دوست سفینہ آئی
تھی۔۔۔۔۔ اسے بیڈ پہ بٹھایا تھا۔۔۔۔۔ پھر زبردستی اسے باہر لے آئی تھی۔۔۔۔۔ اور
خود اندر اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔۔۔۔۔

وہ اس قیامت کے بعد نہیں روئی تھی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جیسے جم گئے تھے

سفینہ نے۔۔۔۔۔ کچن سے نکل کے کوئی پانچویں بار اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

پھر افسوس سے سر جھٹک کے۔۔۔۔۔ اس کے قریب آئی تھی

ایک نگاہ۔۔۔۔۔ اس پہ ڈالی تھی جو کالے رنگ کی۔۔۔۔۔ قمیض شلوار۔۔۔۔۔ پہنے

۔۔۔۔۔ اوپر وہ شال جو سفینہ نے زبردستی اسے اڑوا دی تھی۔۔۔۔۔ چوٹیاں میں سے سارے

بال نکل چکے تھے۔۔۔۔۔ سیاہ رنگت۔۔۔۔۔ ذرد میں تبدیل ہو چکی تھی

”ماہ جبین۔۔۔۔۔“ حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ اللہ انصاف کرنے والا ہے“

اس کے پاس تسلی کے سوا کس نہیں تھا۔۔۔۔۔

”کیا وہ مانتا تھا اس کو۔۔۔۔۔؟“

اس نے دور خلاؤں میں تکتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں۔۔۔۔۔ اس سے سوال کیا تھا۔۔۔۔۔

ان سات گھنٹوں میں وہ پہلی بار بولی تھی۔۔۔۔۔
”بظاہر تو مانتا تھا۔۔۔۔۔“

سفینہ نے مایوسی سے کہا تھا

”مجھے بھی یہی لگا تھا۔۔۔۔۔“ میں بھول گئی تھی بظاہر ماننے میں اور دل سے ماننے میں فرق ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

اس دفعہ وہ بھی دکھ سے بولی تھی۔۔۔۔۔

”جب پہلی بار۔۔۔۔۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔۔۔۔۔ شراب کے نشے میں اس نے گاڑی کہیں ٹھوک دی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی نامحرم دیکھا تھا۔۔۔۔۔ یعنی پہلی بار نگاہیں گرد آلودہ کی

تھی۔۔۔۔۔ بابا نے ہمیشہ مجھے کہا تھا۔۔۔۔۔ اپنی نگاہوں کو قابو میں رکھنا۔۔۔۔۔ یہ تمہارا
خدا کے ساتھ رشتہ مضبوط بھی کرتی ہیں۔۔۔۔۔ اور رشتہ توڑ بھی دیتی ہیں۔۔۔۔۔ رشتہ توڑنے
کی پہلی بنیاد میں نے اس دن رکھی تھی۔۔۔۔۔“
وہ جیسے انہی پرانے دنوں میں کھوگئی تھی۔۔۔۔۔
”میں نہیں جانتی تھی میں نے اسے کیوں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے اگلے دن
۔۔۔۔۔ تہجد میں۔۔۔۔۔ میں نے اس کی زندگی کی دعا مانگی تھی۔۔۔۔۔ پوری
رات۔۔۔۔۔ اسے ہوش نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔“ یعنی میں پہلی بار۔۔۔۔۔ خدا کو مانگنا بھول
گئی۔۔۔۔۔“
وہ خود ہی ہنسی۔۔۔۔۔“
سفینہ کو لگا وہ پاگل ہوگئی ہے۔۔۔۔۔

پھر اسے ہوش آگیا تھا اور میرا ہوش جاتا رہا تھا۔۔۔۔۔ پہلے جن آنکھوں سے خدا نظر آتا تھا
پھر ان سے وہ نظر آتا تھا۔۔۔۔۔ پہلے جس زبان سے خدا کو مانگتی تھی اب اس سے اسے مانگتی
تھی۔۔۔۔۔ پہلے۔۔۔۔۔ جن ہاتھوں سے۔۔۔۔۔ اللہ کو مانگتی تھی۔۔۔۔۔ اب وہ ہاتھ
اسے مانگنے کے لیے اٹھتی تھے میں جس دن بے غرض سے غرض پہ آئی ی اس دن۔۔۔۔۔ خدا
کی محبت۔۔۔۔۔ میرے دل سے نکلی تھی۔۔۔۔۔ وہ حکمران
ہے۔۔۔۔۔ ”بادشاہ۔۔۔۔۔“ وہ جدھر رہتا ہے اکیلا رہتا ہے۔۔۔۔۔ ”تو کیسے ممکن
تھا۔۔۔۔۔ کہ ایک بندے کے ساتھ میرے دل میں رہ لیتا۔۔۔۔۔“ ”شرک کے درجوں میں
کیا عشق مجازی بھی کوئی درجہ ہے۔۔۔۔۔؟“ ”کیا وہ عشق مجازی کو معاف کر دے گا۔۔۔۔۔؟
محبت۔۔۔۔۔ ایک خود غرض جذبہ ہے۔۔۔۔۔ یہ صرف خدا کا حوصلہ ہے کہ وہ بے غرض
محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ انسان کی محبت تو غرض میں لپٹی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ خدا کی محبت کے
معیار نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ انسان کی محبت کے معیار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور

افسوس۔۔۔۔۔ ہم انسان کی محبت کے معیار کے لیے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور

بے قدرے ہو کے رسوا ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ کھوئے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی اس کی آنکھوں میں کرب لہجے میں دکھ تھا۔۔۔۔۔

سفینہ نم آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جسے رنگت کی بنا پر دنیا ابتدا ۶۱ سے دھتکارتی

آئی تھی

”تمہیں پتہ ہے۔۔۔۔۔ انسان کی بربادی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے پہلی دفعہ مڑ کے۔۔۔۔۔ سفینہ کی طرف دیکھا

اس نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔۔۔

”جہاں وہ انسانوں کو خدا پہ ترجیح دینے لگتا ہے۔۔۔۔۔“

اس دکھ سے کہہ کے رخ پھر دوسری جانب موڑ لیا تھا۔۔۔۔۔

”میں نے تمہیں ابتداً ۶۱ میں کہا تھا ماہ جبین تم اس کی خواہش مت کرو۔۔۔۔۔ چہروں سے

انسانوں کی پہچان نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

اس نے پلو سے آنکھوں کے گوشے پونچھتے ہوئے اسے یاد دہانی کروائی۔۔۔۔۔

”میں نے اس کی خواہش نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔۔۔۔۔ میں

نے خدا سے سب جانتے ہوئے بھی اسے مانگا تھا بار بار مانگا تھا۔۔۔۔۔ ضد کر کے مانگا

تھا۔۔۔۔۔ مجھے بس وہ چاہیئے تھا۔۔۔۔۔ ”اپنی حیثیت معلوم ہوتے ہوئے

بھی۔۔۔۔۔ میں نے اسے اپنی غرض کے لیے چاہا تھا۔۔۔۔۔“

پھر خدا نے مجھے دے دیا جو میں نے چاہا۔۔۔۔۔

”لیکن اب مجھے پتہ چل گیا ہے۔۔۔۔۔ کہ جو چیز خدا نہ دے رہا ہو اس کی ضد نہیں کرنی

چاہیئے بلکہ اس کی طلب بھی چھوڑ دینی چاہیئے کیونکہ انسان نادان ہے۔۔۔۔۔ جو چیز خدا

جانتا ہے انسان نہیں جان سکتا۔۔۔۔۔“

اس دفعہ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔۔۔۔۔

”میں سوچتی ہوں۔۔۔۔۔ مرد کو یوں۔۔۔۔۔ ہر چیز اپنی عورت میں مکمل ہی چاہیئے ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ اپنی حوس پوری کرتے وقت وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنی اولاد تک کو بھول گیا یوں چھوڑ گیا جیسے یہ صرف میری اولاد ہے۔۔۔۔۔“ اس نے کہا کہ میری اولاد مجھ سے بھی بد صورت ہوگی۔۔۔۔۔“

وہ تڑپ کے اس کی طرف پلٹی تھی۔۔۔۔۔

”اس وقت میرا دل دہل گیا۔۔۔۔۔

”کیا واقعی ہی ایسا ہوگا۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے پیدا ہوتے ہی مار دوں گی۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔۔۔۔۔

”میں ماہ جبین کی کہانی دوبارہ شروع نہیں ہونے دوں گی۔۔۔۔۔“

وہ ہذیانی کیفیت میں کہہ رہی تھی

”خدا کی دنیا بہت ظالم ہے۔۔۔۔۔“

اسے آنے والے وقت سے خوف آیا۔۔۔۔۔

ایسا نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ ماہی۔۔۔۔۔ تم دیکھنا اللہ تمہیں بہت خوبصورت اولاد دے گا۔۔۔۔۔

اس نے اسے ساتھ لپٹا کے تسلی دی۔۔۔۔۔

اس نے اس کے گلے لگ کے اپنے دل کا غبار نکال دیا۔۔۔۔۔

وہ اونچی آواز میں جیسے بین کرتے ہوئے رورہی تھی۔۔۔۔۔

”ماہی۔۔۔۔۔ خدا کے لیے صبر کرو۔۔۔۔۔ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تو۔۔۔۔۔ تم

بھی جانتی ہو ابھی تمہیں طلاق نہیں ہوئی ی رجوع۔۔۔۔۔ کی گنجائش باقی

ہے۔۔۔۔۔ میں خود اس سے رابطہ کرونگی۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں پڑ جاؤنگی میں خود اسے

منالونگی۔۔۔۔۔“

اس نے اس کے آنسو پونچھ کے اسے تسلی دی۔۔۔۔۔

”نہیں سفینہ۔۔۔۔۔ میں کسی طور اب اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی میں خود کو اور

نہیں گراؤنگی۔۔۔۔۔ وہ مجھ پہ اور اپنی ہی اولاد پہ تھوک دیا۔۔۔۔۔ میں خود کو اور اپنی

اولاد کو سستا نہیں کرونگی۔۔۔۔۔ جو انسان ایک دفعہ آپ کو چھوڑ جائے تو اس کے ساتھ مکمل

قطع تعلق کرنے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔۔۔۔۔” میں کل ہی یہاں سے چلی جاؤنگی پھر

واپس نہیں آؤنگی۔۔۔۔۔

اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے جیسے تہیہ کیا۔۔۔۔۔

”تم ایسے کیسے جاسکتی ہو۔۔۔۔۔“؟“کہاں جاؤنگی تم۔۔۔۔۔“؟

سفینہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

”اسی میں ہی بہتری ہے میرے لیے۔۔۔۔۔“ میں کہیں بھی چلی جاؤنگی۔۔۔۔۔ یہاں

نہیں رہونگی

”یہاں رہو نگی تو۔۔۔۔۔۔ ہر چیز میں وہ ہی نظر آئے گا ہر چیز میں اس کا چہرہ نظر آئے

گا۔۔۔۔۔۔ میں اس کے چہرے خوشبو عکس سے فرار چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ میں اس سے فرار

چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ اور وہ آزادی مجھے یہاں رہ کے نہیں مل سکتی۔۔۔۔۔۔“

وہ مضبوطی سے بولی۔۔۔۔۔۔

اب وہ فیصلہ کر چکی تھی تو یکسر مختلف نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔۔

”ٹھیک ہے جہاں تم خوش رہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔۔“

اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔۔

”زندگی میں ہمدرد لوگ کم ہی ملا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”اور اس کی تو زندگی میں یوں بھی ہمدردوں کی کمی تھی۔۔۔۔۔۔

اگلی صبح اس نے ایسا ہی کیا تھا۔۔۔۔۔۔ سفینہ کے لاکھ روکنے منع کرنے کے باوجود۔۔۔۔۔۔ وہ

اللہ کا نام لے کے وہاں سے چلی گئی تھی۔۔۔۔۔۔

اسے نہیں پتہ تھا کہ۔۔۔۔۔ اسے کہاں جانا ہے لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ خدا کی زمین
بہت بڑی ہے۔۔۔۔۔

”اسے اب خدا کی طرف ہی لوٹنا تھا دنیا کے دھتکارے ہوئے لوگوں کا واحد سہارا خدا ہی بچتا
ہے۔۔۔۔۔“

اور اسے یقین تھا خدا نہیں دھتکارے گا اسے۔۔۔۔۔

یہاں سے اس کی زندگی کے نئے باب کا آغاز ہوا تھا جس میں۔۔۔۔۔ شہباز کہیں نہیں تھا
یا شاید وہ ہر جگہ تھا

دل کی کسی خانے میں چھپا ہوا۔۔۔۔۔

یاد فن ہوئی ی اس لاش کی طرح جسے دفنا کے ہمیشہ کے لیے بھلا دیا جائے۔۔۔۔۔



اندھے نکالتے ہیں میرے چہرے سے نقص

بہروں کو یہ شکوہ ہے کہ غلط بولتا ہوں میں

جس وقت۔۔۔۔۔ وہ نیوز بیورو سے نکلا تھا اس وقت وہ کافی پرسکون دیکھائی دے رہا تھا وہ

احساسات جذبے۔۔۔۔۔ چھپانے کا ہنر جانتا تھا وہ جانتا تھا دشمن کو کیسے زیر کیا جاتا

ہے۔۔۔۔۔ محض ایک مسکراہٹ کے ذریعے۔۔۔۔۔ صرف دماغ سے۔۔۔۔۔ وہ اپنے

اندر کے جذبوں کو چہرے پر رقم کرنے کا عادی نہیں تھا۔۔۔۔۔

وہ جانتا تھا کس سے کتنی محبت کرنی ہے۔۔۔۔۔ ”؟ کس سے کس حد تک دشمنی کرنی

ہے۔۔۔۔۔ ”؟ وہ تاش کے سارے پتوں سے واقف تھا۔۔۔۔۔

”وہ آسانی سے معاف نہیں کرتا تھا کم از کم اپنی ذلت کو۔۔۔۔۔ وہ وہاں خان تھا۔۔۔۔۔ وہ

صاف گو تھا۔۔۔۔۔ وہ دشمن کی اس رگ پہ ہاتھ رکھتا تھا کہ اسے اگلی سانس لینے کی مہلت

نہیں دیتا تھا اس سے کم ہی لوگ واقف تھے۔۔۔۔۔ وہ کسی پہ کم ہی کھلتا تھا۔۔۔۔۔ اسے

ہاری ہوئی بازی۔۔۔۔۔ جیتی آتی تھی بعض اوقات۔۔۔۔۔ وہ جان کے بازی ہار جاتا
تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا وہ جیتنا نہیں جانتا تھا۔۔۔۔۔
گاڑی میں بیٹھ کے۔۔۔۔۔ اس نے موبائی ل نکالا۔۔۔۔۔ اب وہ کسی کا نمبر ڈائی ل کر رہا تھا
دوسری بیل پہ کال اٹھالی گئی تھی۔۔۔۔۔
دوسری طرف سے صدیقی کی خوشگوار سی آواز ابھری تھی۔۔۔۔۔
”کیسے ہیں وہاں صاحب۔۔۔۔۔؟“

اس دو کمروں کے فلیٹ میں موجود اس خوب رو شخص جو اس وقت سادہ سی ٹراؤزر شرٹ پہنے
ہوئے تھا۔۔۔۔۔ ہاتھ میں پکڑے کافی کے کپ میں چیچ ہلاتے ہوئے پوچھا تھا۔۔۔۔۔
”حالات اچھے نہیں چل رہے تھے۔۔۔۔۔؟“ مگر اب اللہ کے کرم سے حیریت
ہے۔۔۔۔۔“

اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے ذو معنی لہجے میں کہا۔۔۔۔۔

”وہ ذور سے ہنسا تھا۔۔۔۔

”اڑتی اڑتی ہم تک بھی پہنچی ہے۔۔۔۔۔“ حریف کم رکھا کیجی مئے ناجناب آپ نے توہر

دوسرے شخص سے دشمنی گانٹھ رکھی ہے۔۔۔۔۔

اس نے فون اسپیکر پہ ڈالا

اور دودھ فریج سے نکالتے ہوئے بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔۔۔۔۔

جو لوگ ہمارے معیار کے نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ وہ دشمن پہ اتر آتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمارا کیا

کمال۔۔۔۔۔؟“

وہ بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔

”ہمارا لائیو کوئی خدمت۔۔۔۔۔؟“

اس نے چولہے پہ دودھ رکھ کے ماچس جلاتے ہوئے انہوں نے خوشدلی سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”لڑکیاں قابو میں کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔

گاڑی ریورس کرتے ہوئے اس نے عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔

تو وہ پہلے چونکے پھر ذور سے حد دیئے۔۔۔۔۔

وہاج صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں چالیس سال سے اوپر کے بندے جس کے سامنے کے بالوں

میں چاندی صاف دیکھائی دیتی ہے۔۔۔۔۔ اس سے کیا پوچھ بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔؟

انہوں نے مصنوعی سرد آہ بھری۔۔۔۔۔

”آپ کو کس نے کہہ دیا عورت کو۔۔۔۔۔ ظاہر سے قابو کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو دماغ کے

کھیل ہیں۔۔۔۔۔” دماغ سے کھیلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ چالیس کی بات کرتے ہیں عورت

تو ساٹھ سال کے بوڑھے پہ بھی فدا ہو جاتی ہے اکثر۔۔۔۔۔“

اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا

معاملہ انھیں گھمبیر لگا تھا

”کیا بات ہے خان جی۔۔۔۔۔ کوئی سی سنجیدہ معاملہ ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ یکدم کر سی کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔۔۔۔۔

”معاملے سنجیدہ نہیں پیچیدہ ہوتے ہیں انھیں اگر سنجیدگی سے حل نہ کیا جائے تو۔۔۔۔۔ وہ خطرہ بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ اپنی مسلسل کارڈرائی یو کرتے ہوئے مسکرا کے اپنی سابقہ ٹون میں ہی بات کر رہا تھا یہ اس کا۔۔۔۔۔ مخصوص انداز تھا جو وہ ان لوگوں کے ساتھ اپناتا تھا جن کے ساتھ اس کی بے تکلفی ہوتی تھی۔۔۔۔۔

”خان جی آپ جیسی عقل کہاں ہے ہمارے پاس کچھ بتائیں گے تو معاملے کی سنگینی تک پہنچے گے۔۔۔۔۔“

اس نے ہنس کے۔۔۔۔۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے اصل مدعے کے متعلق۔۔۔۔۔ استفسار کیا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کی فلم جو ہے نا وہ رانی ہی کرے گی۔۔۔۔۔“

اس نے یوٹرن لیتے ہوئے اسے بتایا نہیں تھا حکم بھی نہیں دیا تھا صرف آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔
”پر خان جی اتنے بڑے ہنگامے کے بعد میں یہ سمجھوں کہ آپ معاف کرنے پہ یقین رکھتے
ہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا چو لہا بند کر کے۔۔۔۔۔ دوبارہ کرسی پہ بیٹھ کے اسے کرید رہا تھا
کافی میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔۔۔۔۔
”کم از کم آپ سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں میں منافقت پہ یقین
نہیں رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ تو خدا کا حوصلہ ہے جو بندے کو
معاف کر دیتا ہے انسان معاف کر کے بھی معاف نہیں کیا کرتا۔۔۔۔۔ اور میں تو یوں بھی
معافی کے حق میں نہیں ہوں۔۔۔۔۔“
میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں۔۔۔۔۔
”آنکھ کے بدلے آنکھ کان کے بدلے کان۔۔۔۔۔“

”عزت کے بدلے عزت۔۔۔۔۔“

اس نے۔۔۔۔۔ اس دفعہ۔۔۔۔۔ تھوڑا کڑوا لہجہ اپنایا تھا۔۔۔۔۔

وہ دل کھول کے ہنسا تھا وہ وہاں کو جانتا تھا۔۔۔۔۔

”پھر آپ عزت کے بدلے عزت لیں گے۔۔۔؟“

اس نے دلچسپی سے اگلا سوال پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”مرد اپنی بے عزت بھول جاتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اپنی عورت کی بے عزتی وہ معاف کرنے کی

ہمت نہیں رکھتا۔۔۔۔۔“

اگر بات میرے تک رہتی تو میں ایک کمزور صنف کے ساتھ مقابلے پہ یقین نہیں رکھتا۔۔۔۔۔

”لیکن یہاں بات میری بیوی کی ہے۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے میں خود بخود سختی در آئی تھی۔۔۔۔۔

”شام میں ملتے ہیں آپ کے فلیٹ پہ سنجیدگی سے بات کرتے ہیں اس متعلق۔۔۔۔۔“

وہ خود کو سنبھال چکا تھا اس لیے اگلی بات۔۔۔۔۔ خوشدلی سے کہی تھی۔۔۔۔۔
اور کال کاٹ دی تھی

اب اس کی ساری توجہ ڈرائی یونگ پہ تھی۔۔۔۔۔
دور اس فلیٹ میں وہ سفید بالوں والا شخص۔۔۔۔۔ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔۔۔۔۔



کیا خرابی ہے میرا ہونے میں
تم کو آتا تو ہے مکر جانا۔۔۔۔۔

اسلام آباد سے جس وقت وہ دوبارہ۔۔۔۔۔ سوات پہنچا تھا اس وقت۔۔۔۔۔ شام کے
سامنے گہرے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ اس کی گاڑی کے مخصوص ہارن کی آواز سن کے وہ سیدھا
گلاس ونڈو کی طرف بڑھی تھی جہاں۔۔۔۔۔ سے باہر کا منظر۔۔۔۔۔ صاف دیکھائی دے
رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ گاڑی سے اتر کے اب۔۔۔۔۔ گاڑی کو لاک کر کے ڈرائی پور

کو۔۔۔۔۔ کوئی ہی ہدایت دے رہا تھا ہلکے آسمانی رنگ کی قمیض

شلوار۔۔۔۔۔ اوپر۔۔۔۔۔ سلور واسکوٹ پہنے۔۔۔۔۔ بال بکھرے ہوئے تھے وہ کافی
تھکا ہوا لگ رہا تھا

اب اس کا رخ اندر کی طرف تھا وہ بھی کھڑکی میں سے ہٹ گئی تھی۔۔۔۔۔
وہ جیسے ہی۔۔۔۔۔ ٹی وی لائونچ میں گیا۔۔۔۔۔ ٹی وی لائونچ ویران پڑا تھا۔۔۔۔۔
”بوا۔۔۔۔۔“

وہ بوا کو آوازیں۔۔۔۔۔ دیتا ہوا۔۔۔۔۔ صوفے پہ بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد
ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

”بوا تیزی سے کچن سے باہر نکلی تھی۔۔۔۔۔“

”ارے آپ۔۔۔۔۔ آگئے ہیں وہاں بیٹا۔۔۔۔۔“

وہ خوشدلی سے بولی تھی۔۔۔۔۔

”جی بوا۔۔۔۔۔“

زری کدھر ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے سر سری پوچھا۔۔۔۔۔

”وہ کمرے میں ہیں۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے اسے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

”چائے بجھوادوں آپ کے لیے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے عام سے لہجے میں۔۔۔۔۔ پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ کھانا ہی کھاؤں گارات کا۔۔۔۔۔“

وہ کہتا ہوا زینے عبور کر دیا۔۔۔۔۔

”وہ جیسے ہی دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔۔۔۔۔“

وہ چھلانگ مار کے بیڈ سے اتری اور اس کے سامنے جا کے کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔

اس نے حیرت سے اسے دیکھا

”آگئے آپ۔۔۔۔“

وہ پر جوش لہجے میں بولی۔۔۔۔

”نہیں تو ابھی راستے میں ہوں۔۔۔۔“

اس نے کھڑی اتار کے۔۔۔۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے مسکرا کے اسے چھیڑا تھا۔۔۔۔

ویسے تم میرا انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔؟“

اس نے۔۔۔۔ بیڈ پہ بیٹھ کے۔۔۔۔ دلچسپی سے پوچھا تھا۔۔۔۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔“

وہ گڑبڑا گئی۔۔۔۔۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔۔۔۔

”وہ میں نے۔۔۔۔۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا“
وہ بھی بیڈ کے کونے پہ ٹک گئی تھی۔۔۔۔۔
اور آخر رک رک کے وہ بات کہہ دی تھی جو کہنا چاہ رہی تھی۔۔۔۔۔
”شکریہ۔۔۔۔۔ کس بات کا۔۔۔۔۔؟“
اس نے مصنوعی حیرت چہرے پہ سجا کے پوچھا تھا۔۔۔۔۔
”وہ جس طرح آج آپ نے سب کچھ سنبھالا۔۔۔۔۔“
اس نے۔۔۔۔۔ نظریں جھکا کے۔۔۔۔۔ ٹھہر ٹھہر کے کہا تھا
وہ تذبذب کا شکار تھی۔۔۔۔۔
اس نے کچھ کہا نہیں تھا بس مسکرا دیا تھا
اور انگلیوں سے۔۔۔۔۔ اپنی کنپٹیاں مسلنے لگا تھا۔۔۔۔۔
پتہ نہیں وہ پریشان تھا یا اتھکا ہوا تھا

اس نے نظر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا

”ہاں بس سر میں تھوڑا درد ہے۔۔۔۔۔“

اس نے مسکرا کے اسے جیسے ٹالا تھا۔۔۔۔۔

”میں دبا دوں آپ کا سر۔۔۔۔۔؟“

اس نے ہچکچاتے ہوئے نظر چرا کے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”اتنی مہربانیاں کس خوشی میں۔۔۔۔۔؟“

وہ ہاتھ باندھ کے۔۔۔۔۔ مزے سے بولا۔۔۔۔۔

اس نے شرما کے نظر جھکالی۔۔۔۔۔

”ادھر آئیں دبا دوں سر۔۔۔۔۔؟“

اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اس کے تھوڑے قریب ہو کے بیٹھی۔۔۔۔

”اگر تم اس دفعہ میرے منہ پہ تھپڑ مارنے کا ارادہ نہیں رکھتی تو میں تمہاری گود میں سر رکھ دوں۔۔۔۔؟“

اس نے سر اٹھا کے رخ موڑ کے پیچھے بیٹھی زرباش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا

تو وہ جھنپ گئی تھی۔۔۔

”اچھا چلو خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔۔۔۔“

اس نے اسے خاموش پا کے خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا

اور سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا

وہ اب اس کا سر دبا رہی تھی۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر بعد۔۔۔۔۔ اس کی سانس بھاری ہونے لگی۔۔۔۔۔ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا
تھا۔۔۔۔۔

وہ کتنی ہی دیر قریب سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔۔۔۔۔
پھر خود ہی مسکرا دی۔۔۔۔۔

سائیڈ ٹیبل پہ بجتے موبائی ل نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔۔۔۔۔
اس نے دیکھا وہاں بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔۔۔۔۔

موبائی ل بجنے کے بعد خود بخود خاموش ہو گیا تھا
اس نے سرہانے پہ وہاں کا سر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی
رات کے کھانے کے لیے۔۔۔۔۔ بوا کو ہدایات دینی تھی۔۔۔۔۔

اس نے پیر بیڈ سے نیچے اتارے ہی تھے کہ وہاں کا موبائی ل ایک دفعہ پھر بج اٹھا۔۔۔۔۔
اس نے کچھ سوچ کے آگے بڑھ کے کال پک کر لی۔۔۔۔۔

اور کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔۔

”دوسری طرف سے آتی کسی عورت کی۔۔۔۔۔ غصیلی آواز نے۔۔۔۔۔ اسے چونکا دیا
تھا۔۔۔۔۔“



اتنی قبریں نہ بناؤ میرے اندر

میں چراغوں کو جلاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

آگ اگلتا سورج۔۔۔۔۔ ان دنوں شانت تھا۔۔۔۔۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں اس

مصروف سڑک کی ہر شے میں رنگ بھر چکی تھی۔۔۔۔۔ لاہور کے لوگ۔۔۔۔۔ جو پورے سال

کی گرمی سے گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے لیے۔۔۔۔۔ یہ موسم سرما

کسی۔۔۔۔۔ نعمت سے کم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ سردی نے یہاں کی ساری ختنکی ختم کر دی

تھی۔۔۔۔۔

وہ جس لمحے۔۔۔۔۔ بس اسٹاپ پہ اتری تھی۔۔۔۔۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔۔۔۔۔
اس نے اس وقت کھلے سے عبا یہ میں اپنا بے ڈھنگا وجود چھپایا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور دوپٹے کے
ساتھ چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور کندھے کے ساتھ ایک بوسیدہ بیگ لٹکا رکھا تھا جس میں ضرورت
کا سامان تھا۔۔۔۔۔

اتنا لمبا۔۔۔۔۔ سفر طے کرنے کی وجہ سے اس کی طبیعت اچھی خاصی خراب ہو چکی تھی
۔۔۔۔۔ اس کا جی متلارہا تھا لیکن وہ پاؤں میں بوسیدہ سی جوتیاں پہنے چلتی ہی جا رہی
تھی۔۔۔۔۔

”بس کا کرایہ دینے کے بعد اس کے پاس اتنا کرایہ نہیں تھا کہ وہ۔۔۔۔۔ کسی رکشہ میں بیٹھ
سکے

”انسان کی زندگی میں بعض اوقات۔۔۔۔۔ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب وہ خود کو بے بسی کی
اتھاہ گہرائیوں میں پاتا ہے۔۔۔۔۔“

”بے بسی۔۔۔۔؟“

اس نے چونک کے اپنے باپ سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”جواب میں وہ ہنسنے لگے

”ہاں بے بسی۔۔۔۔۔ اللہ اور انسان کے“ ا کے۔۔۔۔۔ درمیان کا پہلا

فرق۔۔۔۔۔“

”اللہ بے بس نہیں ہے اور انسان بہت بے بس ہے۔۔۔۔۔“

گاڑی کے تیز ہارن کی آواز نے اسے۔۔۔۔۔ حال میں لا پٹھا تھا۔۔۔۔۔

وہ پانی کا نازک بلبلا یکدم ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا

اس نے خود کو اکیلا پایا تھا۔۔۔۔۔

اس جگہ جہاں سب لوگ اس سے مختلف تھے۔۔۔۔۔

یا شاید وہ سب سے مختلف تھی۔۔۔۔۔

وہ چپ چاپ سر جھکا کے چلتی ہی جا رہی تھی
وہ نہیں جانتی تھی اس کی منزل کیا ہے۔۔۔۔۔
چلتے چلتے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ایک دربار کے داخلی دروازے سے ہوتی
ہوئی۔۔۔۔۔ زمین پہ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔
اب وہ مزید نہیں چل سکتی تھی
وہ لمبے لمبے سانس لے کے خود کو نارمل کرنے لگی۔۔۔۔۔
پاؤں سے جوتیاں اتار کے ایک طرف رکھی۔۔۔۔۔
چہرے پہ نقاب ہنوز تھا۔۔۔۔۔
وہ بس پیڑ کے ساتھ سر ٹکا کے بیٹھی۔۔۔۔۔ خالی خالی نظروں سے۔۔۔۔۔ یہاں آتے
لوگوں کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔

یہ عجیب دنیا تھی۔۔۔ اس نے نظر گھما کے دیکھا شاید یہاں کوئی یی اسے گھور رہا ہو کسی کی
نظروں میں تمنخسر ہو کسی کے لفظوں میں تذلیل لیکن یہاں کوئی یی بھی اسے یوں نہیں دیکھ رہا
تھا۔۔۔۔۔

اسے یہاں بیٹھی دوپہر سے شام ہو گئی اور کب شام کے سائے رات میں تبدیل ہوئے اسے
کچھ خبر نہ ہوئی یی۔۔۔۔۔

کسی کے پکارنے پہ اس نے چونک کے گردن موڑ کے دیکھا۔۔۔۔۔

سامنے ایک سفید کپڑوں والے بزرگ کھڑے تھے۔۔۔۔۔

جن کی لمبی سفید داڑھی تھی اور چہرہ پر نور۔۔۔۔۔

”گھر نہیں جانا بیٹا۔۔۔۔۔“؟

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

”تو اس نے نظریں جھکالی۔۔۔۔۔

”جن کا کوئی ی گھر نہیں ہوتا انہیں یہاں پناہ نہیں مل سکتی کیا۔۔۔۔۔؟“

اس نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

انہوں نے سرتا پیر اس لڑکیوں کو دیکھا۔۔۔۔۔

”کیا شوہر سے روٹھ کے آئی ہو۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے نرمی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں دنیا کی دھتکاری ہوئی ہو۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے میں دکھ تھا

”چلو کوئی ی نہیں۔۔۔۔۔“

وہ مسکرا دیئے تھے

ان کابات کو اتنا عام لینا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔۔۔۔۔

”وہ بانٹ نہیں سکتا تمہاری محبت کو۔۔۔۔۔“ ”بہت خوش قسمت ہو۔۔۔۔۔“

وہ اس سے تھوڑے فاصلے پہ بیٹھ گئے تھے۔۔۔۔۔

”جن سے وہ محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ انہیں دنیا کا ہونے نہیں دیتا۔۔۔۔۔ وہ ان کو اپنی طرف

موڑ ہی لیتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ پیڑ کے ساتھ ٹیک لگا کے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہہ رہے

تھے۔۔۔۔۔

”وہ مجھ سے محبت کیسے کر سکتا ہے میں نے تو ایک بندے کی محبت کے لیے اس کو چھوڑ دیا

تھا۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکا کے شرمندگی سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”تم نے چھوڑا تھا اس نے تو نہیں چھوڑا تھا نا۔۔۔۔۔ انسان چھوڑ دے خدا کو تو بندہ نہیں

گرتا۔۔۔۔۔ خدا چھوڑ دے بندے کو تو۔۔۔۔۔“ ”بندہ گر جاتا ہے۔۔۔۔۔“

ان کے لہجے میں نرمی کا عنصر نمایاں تھا

چہرے پہ مسکان تھی۔۔۔۔۔

”اسے بندے کا ساتھ نہیں چاہیئے ہوتا اس کے لیے دنیا میں بہت بندے ہیں

۔۔۔۔۔ لیکن بندے کو تو اس کا ساتھ چاہیئے ہوتا ہے نا۔۔۔۔۔“ پھر بندہ اس کو چھوڑ کے

آخر کہاں تک جاسکتا ہے اسے لوٹنا ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے رسان سے اسے سمجھایا تھا۔۔۔۔۔

”لیکن باباجی۔۔۔۔۔ یہ دنیا بھی تو اس کی ہی تخلیق ہے وہ نہیں دھتکار تا دنیا کیوں دھتکار دیتی

ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے پہلی بار سر اٹھا کے دکھ سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”یہ اللہ اور انسان کے“ الف ”کا دوسرا فرق ہے۔۔۔۔۔“

”تم نے کبھی سوچا ہے۔۔۔۔۔؟“

”الف سے اللہ اور الف سے ہی انسان کیوں ہے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے۔۔۔۔۔ مسکرا کے اس سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

اس نے نا سمجھی سے نفی میں سر ہلادیا تھا۔۔۔۔۔

”میں بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے اس کی طرف رخ موڑا تھا۔۔۔۔۔

”وہ بندے کو فرق بتانے کے لیے۔۔۔۔۔“

دونوں کے الف کو۔۔۔۔۔ ایک ہی تناظر میں لا کے۔۔۔۔۔ فرق واضح کرتا ہے۔۔۔۔۔

”جیسے۔۔۔۔۔ اللہ معاف کرتا ہے۔۔۔۔۔ انسان معاف نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اللہ قبول

کرتا ہے انسان دھتکار دیتا ہے۔۔۔۔۔ اللہ کے بس میں سب کچھ ہے انسان بے بس

ہے۔۔۔۔۔ اللہ رحیم ہے انسان ظالم ہے۔۔۔۔۔“

اللہ کے ”الف“ اور انسان کے ”الف“ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔۔۔

انہوں نے۔۔۔۔۔ انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔۔۔۔۔

”لیکن میرے جیسے لوگوں کی۔۔۔۔۔ اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔۔۔۔۔ عجیب سا دکھ

خدا کی تخلیق کو اس کی بڑائی کی کو مانتی ہو۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے پلٹ کے اس سے عام سے لہجے میں کہا تھا

”ہاں۔۔۔۔۔۔۔“

”اس نے فٹ سے جواب دیا تھا

”پھر خود کو کیوں نہیں مانتی۔۔۔۔۔؟“

تم بھی تو اس کی تخلیق ہو۔۔۔۔۔“

انہوں نے جیسے اسے باور کروایا تھا

”میں تو ایک انسان ہوں“

وہ نا سمجھی سے بولی تھی

”یہی تمہارا حوالہ ہے۔۔۔۔۔“ ”یہی تمہاری پہچان۔۔۔۔۔“ ”یہی تمہارا ٹیلنٹ۔۔۔۔۔“

انہوں نے جیسے اسے احساس دلانا چاہا تھا۔۔۔۔۔

”غلطی کدھر ہے پھر۔۔۔۔۔؟“

اس کی سوئی ابھی تک یہی اٹکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

ادھر۔۔۔۔۔ دل میں۔۔۔۔۔“

انہوں نے دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔۔۔۔۔

”یہ کمال بھی تمہیں ہی حاصل ہے۔۔۔۔۔ دل میں کھوٹ رکھنے کا۔۔۔۔۔ آنکھوں کے فساد کو

دل تک پہنچنے سے روک لو۔۔۔۔۔ تم کامیاب ہو۔۔۔۔۔“

وہ مطمئن ہوئی تھی یا نہیں خاموش ضرور ہوگئی تھی۔۔۔۔۔

”چلو میرے ساتھ۔۔۔۔۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔۔۔

”کہاں۔۔۔۔۔؟“

اس نے سر اٹھا کے نا سمجھی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”اس کے راستے۔۔۔۔۔“

”اس کے پاس۔۔۔۔۔“

”میں تمہیں اس تک پہنچنے کا شارٹ کٹ دیکھاؤں گا۔۔۔۔۔“

وہ پتہ نہیں کیا سوچ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

ان کی پیروی میں چلنے لگی تھی۔۔۔۔۔

”میں کدھر رہو نگی۔۔۔۔۔؟“

اس نے چلتے چلتے یوں ہی پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”یہی ادھر میرے اور میری بیوی کے ساتھ اس دربار میں۔۔۔۔۔“

انہوں نے اسے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔

انہوں نے دو گلی چل کے ایک بوسیدہ سے دروازے پہ دستک دی تھی۔۔۔

”کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا تھا۔۔۔۔

سامنے ایک۔۔۔۔۔ نورانی چہرے والی بوڑھی عورت کھڑی تھی۔۔۔۔

”آ جاؤ بیٹا۔۔۔۔۔“

انہوں نے اندر داخل ہونے کے بعد اسے پکارا تھا

وہ چپ چاپ سر جھکا کے اندر داخل ہو گئی تھی۔۔۔۔

اس بوڑھے شخص نے اس کا مختصر تعارف کروایا تھا۔۔۔۔

ان دونوں میاں بیوی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا انہوں نے بس اسے کھلے دل سے قبول کیا

تھا۔۔۔۔۔

اس دن ماہ جبین کو یقین ہو گیا تھا اس دنیا میں ہر کوئی ی شہباز خان نہیں ہوتا۔۔۔۔۔



پاؤں رکھتے ہیں جو مجھ پہ انہیں احساس نہیں

میں نشانات مٹاتے تھک جاتا ہوں۔۔۔۔۔

”جی آپ کون۔۔۔۔؟“

اس نے قدرے آہستہ آواز میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”دوسری طرف بڑی حویلی کے اس کشادہ کمرے کے صوفے سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی

چال میں اور چہرے پہ رعونت واضح تھی۔۔۔۔۔

”تم کون ہو۔۔۔۔؟“

جانتے ہوئے بھی انہوں نے پوچھنا اپنا فرض سمجھا تھا۔۔۔۔۔

”میں۔۔۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگی کہ بتائے یا نہ بتائے۔۔۔۔۔۔۔

”جانتی ہوں“ تم وہی رقا صہ ہونا جس نے میری بیٹے کو پھانسا ہے۔۔۔۔۔۔۔

انہوں نے اسے نیچا دیکھانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔

”جی۔۔۔۔۔ میں بیوی ہوں وہاں ج کی۔۔۔۔۔“

خفت کے احساس سے اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے حق میں کمزور سی صفائی دی تھی۔۔۔۔۔

”بس کرو۔۔۔۔۔ تمہارے جیسے لڑکیوں کو ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں۔۔۔۔۔“
وہ اسے بے نقط کی سنانے لگی۔۔۔۔۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور لال آنکھیں لیے وہاں اس کے سامنے تھا۔۔۔۔۔
زرپاش کے طوطے اڑ گئے تھے۔۔۔۔۔

ایک طرف وہاں ج کی ماں اسے باتیں سنارہی تھی تو دوسری طرف۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔
وہاں نے اشارے۔۔۔۔۔ سے اس سے موبائی ل مانگا تو اس نے چپ چاپ موبائی ل اس کی
طرف بڑھا دیا تھا۔۔۔۔۔

دوسری طرف سے آتی آواز سن کے اس کے اعصاب تن گئے تھے۔۔۔۔۔ ماتھے پہ بل نمودار ہوئے تھے۔۔۔۔۔

”تمہاری جیسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں ناجو با آسانی ایسے امیر زادوں کے بستروں کی زینت بن جاتی ہیں۔۔۔۔۔ جن کی اپنی تو کوئی عزت ہوتی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ دوسروں کی عزت کا بھی خیال نہیں کرتی۔۔۔۔۔“

ان کے لہجے میں بظاہر ٹھہراؤ تھا لیکن رعونت نمایاں تھی۔۔۔۔۔

”اماں جان۔۔۔۔“ آپ کو اتنا خیال تو ہونا چاہیئے کہ ”آپ جس سے بات کر رہی ہیں وہ آپ کی بہو ہے۔۔۔۔“

اسے ان کے یہ الفاظ ناگوار گزرے تھے اس لیے کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے وہ جتائے بغیر نہ رہ سکے۔۔۔۔

”ہم نہیں سمجھتے اسے بہو۔۔۔۔۔“

دوسری طرف سے وہاں کی آواز سن کے ان کا لہجہ کچھ دھیمہ ہوا تھا۔۔۔۔۔

”آپ کے یا حویلی والوں کے سمجھنے نا سمجھنے سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔ جس سے آپ

نے اس طرح بات کی ہے وہ میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ آپ اس کو جتنی جلدی قبول کر لیں

آپ سب لوگوں کے لیے اچھا ہے۔۔۔۔۔ آپ میری ماں ہے میرے لیے بہت قابل

احترام ہیں لیکن جس سے آپ نے اس طرح بات کی ہے۔۔۔۔۔ وہ میری بیوی ہے اور اس

سے اس طرح کا سلوک کرنے کی میں کسی کو اجازت نہیں دیتا چاہے وہ میری ماں ہو یا میرا

باپ۔۔۔۔۔“

وہ ایک نظر زرپاش کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔ ان پہ بہت کچھ ظاہر کر گیا تھا

وہ وہاں کا ایسا لہجہ دیکھ کے۔۔۔۔۔ حیران رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ وہاں خان کم ہی لوگوں کے

لیے سٹینڈ لیتا تھا

جو بھی تھا یہ لڑکی اس کے لیے خاص تھی۔۔۔۔۔

”کل آؤں گا حویلی۔۔۔۔۔“

کہہ کے کھٹاک سے فون کاٹ دیا تھا۔۔۔۔۔

پھر ایک تنقیدی نظر سر جھکا کے کھڑی زرباش پہ ڈالی۔۔۔۔۔

”تم کیوں سر جھکا کے کھڑی ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”تم نے شادی کی ہے جرم نہیں کیا۔۔۔۔۔ جو تم ہر کسی کی بات سن لیتی ہو۔۔۔۔۔“

اس نے۔۔۔۔۔ نرمی سے اسے سمجھایا تھا

وہ ایک دفعہ پھر بغیر جتائے۔۔۔۔۔ اس کو تحفظ دے چکا تھا۔۔۔۔۔

”تم پیکنگ شروع کرو۔۔۔۔۔“ کل حویلی جانا ہے۔۔۔۔۔“

وہ کہہ کے پلٹا تو اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کے پلٹا۔۔۔۔۔

”میں ہوں تمہارے ساتھ یقین کرو کوئی وہاں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکے گا۔۔۔۔۔“

اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کے نرمی سے سمجھایا تھا۔۔۔۔

اس نے پہلی بار سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔

اس کی آنکھوں کی سچائی یہ اسے یقین آیا تھا۔۔۔۔

اس نے مسکرا کے سر جھکا لیا تھا

اسے یقین تھا وہاں کے ہوتے ہوئے اسے کوئی ی کچھ بھی نہیں کہہ پائے گا۔۔۔۔



اب تو آنکھوں میں فقط دھول ہے کچھ یادوں کی

ہم اسے یاد بھی آئے تو کب یاد آئے۔۔۔۔

نومبر کے اوائل دنوں میں ہی سرد ہواؤں نے زور پکڑا تھا۔۔۔۔ لیکن سوات کی نسبت

یہاں کا موسم قدرے بہتر تھا۔۔۔۔ وہ جس وقت۔۔۔۔ ان کچی پکی سڑکوں پہ گاڑی چلا رہا تھا

تو وہ شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے ماضی میں کھوئی ہوئی تھی انہی سڑکوں پہ پہلی بار وہ وہاں

سے ملی تھی اس وقت۔۔۔۔۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ پھر انہی سڑکوں پہ
اس کے سنگ ہوگی۔۔۔۔۔

اس کی بیوی کی حیثیت سے۔۔۔۔۔ خوش کن احساس نے اسے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا
تھا

کھٹکھٹنیوں سے اس نے وہاں کو دیکھا جو سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کرنے میں مصروف
تھا۔۔۔۔۔

پھر شیشے سے باہر ان۔۔۔۔۔ لہلہاتی کھیتوں کو دیکھنے لگی تھی
تھوڑی ہی دیر بعد وہ۔۔۔۔۔ اس اونچی مگر قدیم طرز پہ بنی حویلی کے سامنے تھے۔۔۔۔۔
اس کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کے دروازے پہ کھڑے گاڑی کے۔۔۔۔۔ چوکنہا ہو کے
دروازہ کھولا۔۔۔۔۔

گاڑی سیدھی پورچ میں پارک کی تھی۔۔۔۔۔

اور وہ گاڑی سے باہر نکلا تھا۔۔۔۔

مالی تمام ملازمین نے عجیب سی نظروں سے۔۔۔۔ انہیں دیکھا تھا۔۔۔۔

اس نے بڑی شان سے زرباش کی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا

اس نے ہچکچاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا

وہ اس کا ہاتھ تھامے اندر حویلی کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔

اندر بیٹھے تمام لوگوں نے گردن گھما کے اس طرف دیکھا تھا پھر سب کی نظریں ادھر ہی جم

گئی تھی۔۔۔

سب سے پہلے۔۔۔۔ میرداد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔۔ دائیں ہاتھ کی

طرف بیٹھے۔۔۔۔ رجب خان نے ان کی پیروی کی تھی۔۔۔۔

دونوں کے چہرے پہ غم و غصہ واضح تھا۔۔۔۔

”مہر النساء اور رضیہ خاموش تماشائی تھیں۔۔۔۔

مہر النساءؑ کی دونوں بیٹیاں ”ہانیہ اور ثانیہ خاموش تماشائی ی تھی۔۔۔۔۔

صوفے پہ بیٹھے صرف ایک شخص کی زرباش کی طرف پیٹھ تھی

وہاں کا چہرہ البتہ سپاٹ تھا

وہ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ نہیں لگائی۔۔۔۔۔

سب سے آخر میں صوفے پہ بیٹھے اس شخص نے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا تھا

اس کی نظروں میں تمسخر تھا

لیکن زرباش کو حویلی کا پورا چہت گھومتا ہوا محسوس ہوا اسے لگا اب وہ سانس نہیں لے پائے گی

وہ وہی ساکت ہوگئی تھی پھٹی پھٹی نظروں سے وہ اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ جو اس

کے سامنے یوں بیٹھا تھا جو بد قسمتی سے اس کا باپ تھا۔۔۔۔۔ لیکن اس کا وہاں کے ساتھ کیا

رشتہ تھا۔۔۔۔۔؟

”ایک سینڈ لگا تھا اسے سمجھنے میں کہ۔۔۔۔۔ جہاں آرا کیوں چاہتی تھی کہ۔۔۔۔۔ اس کی شادی وہاں سے ہو۔۔۔۔۔“

یہ وہ راز تھا جو وہ سینے میں لے کے دفن ہو گئی تھی

آگ کی ضد پہ مت جا پھر سے بھڑک سکتی ہے

راکھ کی تہہ میں شرارہ نہیں دیکھا جاتا

”ایک قدم بھی آگے مت بڑھائی گا۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔“

سب سے پہلے میرداد کی غصیلی آواز اس حویلی میں گونجی تھی۔۔۔۔۔

زرپاش کا دماغ تو سن ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

البتہ وہاں کے حواس بیدار تھے۔۔۔۔۔

”میں نے اپنے قدموں پہ کسی کو اختیار نہیں دیا۔۔۔۔۔ دادا جان۔۔۔۔۔“

اس نے استہزائی یہ کہا تھا۔۔۔۔۔

”اگر آپ اس حویلی میں آنا چاہتے ہیں تو اس لڑکی کو یہی ابھی ابھی طلاق دینی ہو

گی۔۔۔۔۔” میں اس لڑکی کو اپنی بہو کے طور پہ قبول نہیں کروں گا

زرپاش نے سراٹھا کہ دیکھا تھا

اس دفعہ بولنے والے رجب خان تھا۔۔۔۔۔ جن کے لہجے میں۔۔۔۔۔ سختی تھی۔۔۔۔۔

”اگر آپ سب اس خوش منہی کاشکار ہیں کہ آپ لوگوں کے اس ایمو شنل ڈرامہ کی وجہ سے

میں اسے چھوڑ دوں گا تو یہ آپ سب لوگوں کی خام خیالی ہے۔۔۔۔۔“

اس نے۔۔۔۔۔ طنز بھرے لہجے میں جیسے۔۔۔۔۔ ان کی بات کو۔۔۔۔۔ مذاق میں اڑایا

تھا۔۔۔۔۔

زرپاش طلاق کا نام سن کے اس کے شانے کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو چکی تھی

نظریں ہنوز اس نے شہباز خان پہ جمنا رکھی تھی

جو اس وقت سفید رنگ کی قمیض شلوار اوپر کالے رنگ کی شال اوڑھے۔۔۔۔۔ کھڑے

تھے۔۔۔۔۔ چہرے پہ ایک انتقامی مسکان تھی۔۔۔۔۔

وہ ابھی بھی۔۔۔۔۔ ویسے ہی تھے۔۔۔۔۔ صرف سامنے کے بالوں میں چاندی اتر آئی

تھی۔۔۔۔۔ اور چہرے پہ جھریاں۔۔۔۔۔

وہاج کے شانے کے پیچھے چھپ کے کھڑے ہونے کی وجہ سے وہ اس لڑکی کو دیکھ نہیں پارہے

تھے۔۔۔۔۔

رضیہ البتہ۔۔۔۔۔ کھوجتی ہوئی نگاہیں زرباش پہ جمائی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔

مہر النساء کی نظروں میں زرباش کے لیے ستائش تھی

جو بھی تھا لڑکی خوبصورت تھی

ہانیہ اور ثانیہ کی بھی یہی حالت تھی۔۔۔۔۔

”وہاج۔۔۔۔۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔۔۔ یا تم اس لڑکی کو چنو گے یا پھر اس حویلی

کو۔۔۔۔۔ سوچ لو۔۔۔۔۔“

میر داد نے۔۔۔۔۔ کڑک لہجے میں اگلا حکم نامہ جاری کیا تھا۔۔۔۔۔

”میں سوچنے کے لیے ایک منٹ بھی نہیں لوں گا۔۔۔۔۔ میں زرپاش کو کسی قیمت پہ بھی

نہیں چھوڑوں گا اور نہ اس حویلی کو چھوڑوں گا۔۔۔۔۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا نکاح کیا

ہے۔۔۔۔۔ میں کیوں دنیا سے چھپتا پھروں۔۔۔۔۔“

ساتھ ہی زرپاش کا ہاتھ پکڑ کے وہ حویلی کے اندر داخل ہوا تھا۔۔۔۔۔

رجب خان غصے سے آگے بڑھے تھے تو۔۔۔۔۔ میر داد خان نے ان کا ہاتھ پکڑ کے انہیں روکا

تھا۔۔۔۔۔

”ہوش کے ناخن لیں۔۔۔۔۔ رجب۔۔۔۔۔ یہ وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت کچھ کریں گے تو بیٹے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اسے کرنے دیں جو وہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔“

ان کی آواز۔۔۔۔۔ اتنی آہستہ تھی کہ وہ محض رجب خان تک ہی پہنچ سکتی تھی۔۔۔۔۔ انہوں نے پلٹ کے ایک شکایتی نگاہ۔۔۔۔۔ اپنے والد پہ ڈالی۔۔۔۔۔ پھر وہی رک گئے۔۔۔۔۔

”میں تو زپاش کے ساتھ یہی رہوں گا میں بھی دیکھتا ہوں کوئی ی مجھے کیسے روکتا ہے۔۔۔۔۔“ وہ ٹھیک میر داد کے سامنے کھڑا۔۔۔۔۔ انہیں لگا رہا تھا۔۔۔۔۔ شہباز خان نے پہلی دفعہ اس لڑکی پہ ایک نگاہ ڈالی تھی جو آنکھوں میں عجیب سا تاثر لیے ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

وہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی کو تمنخسرانہ نظروں سے نہ دیکھ پائے۔۔۔۔۔

انہوں نے دانستہ نظریں چرائی تھی

دل میں کہیں اس چہرے کے ساتھ شناسائی کی رمل جاگی۔۔۔۔۔

وہ یکدم۔۔۔۔۔ ڈھیلے پڑگئے تھے۔۔۔۔۔

وہاں کی آنکھوں میں عجیب سی خود سری تھی۔۔۔۔۔

میرداد نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی

وہ زپاش کا ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔۔

”ہمارا یہ احسان یاد رکھیئے گا کہ ہم نے اس خود سری کے باوجود۔۔۔۔۔ آپ سے کچھ بھی

نہیں چھینا۔۔۔۔۔ ذرا سوچیئے ہم آپ سے یہ سب لیں تو آپ سڑک پہ نہ

آجائی ینگے۔۔۔۔۔“

میرداد کی آواز اس کی سماعتوں کے ساتھ ٹکرائی تو وہ پلٹا۔۔۔۔۔

”آپ کی سوچ کو آفرین ہے میرا داد خان۔۔۔۔۔“ ”مرد کی اصل دولت اس کی بیوی ہوتی

ہے۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے سب کچھ لے لیں تو بھی میں سڑک پہ نہیں آسکوں

گا۔۔۔۔۔ کیونکہ جب تک میرے پاس زرباش ہے تب تک۔۔۔۔۔ میں اس دنیا کا سب

سے امیر شخص ہوں۔۔۔۔۔“

وہ عام سے انداز میں کہتے ہوئے یہاں موجود ہر شخص کا منہ بند کروا چکا تھا۔۔۔۔۔

میرا داد تپش بھری نظروں سے اسے دیکھ کے رہ گئے

زرباش نے تشکر بھری نظریں اٹھا کر اس شخص کو دیکھا تھا جو واقعی ہی اس کا محافظ تھا۔۔۔۔۔

”چلو زرباش۔۔۔۔۔“

وہ اسے لے کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور دروازہ زور سے ان سب لوگوں کے منہ پہ بند کر

دیا تھا۔۔۔۔۔

اب وہاں موجود نفوس کی آنکھوں میں غصہ اور اندرا یک ابال تھا۔۔۔۔۔

”باباجان آپ نے مجھے کیوں روک دیا۔۔۔۔۔ میں اسے ہاتھ سے پکڑ کے گھر سے باہر نکالتا۔۔۔۔۔“

وہ شکایت بھری نظروں سے۔۔۔۔۔ اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔۔۔۔۔
”اولاد جب قدر برابر آجائے تو پھر۔۔۔۔۔ اس سے بات بھی سوچ سمجھ کے کرنی چاہیئے اور تمہاری اولاد تو یوں بھی نہایت بد تمیز اور خود سر ہے۔۔۔۔۔“

ساری بھڑاس رجب خان پہ نکلی تھی۔۔۔۔۔
”دیکھ لوں گا میں اس لڑکی کو بھی۔۔۔۔۔ پہلے تو وہاں کو واپس اپنی مٹھی میں کرنا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔
”لیکن باباجان میں اس لڑکی کو اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“
رجب ابھی بھی اپنی بات پہ باضد تھے۔۔۔۔۔

”ٹھیک ہے تو جاؤ نکال باہر کرو اسے بھی اور اپنے بیٹے کو بھی۔۔۔۔ ہاتھ دھو بیٹھو گے اپنے بیٹھے سے بھی۔۔۔۔۔“ سمجھ کیوں نہیں آرہی تمہیں آخر۔۔۔۔۔؟

وہ چڑگئے تھے۔۔۔۔۔

تو رجب خان تھوڑے ٹھنڈے پڑگئے اور مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی۔۔۔۔۔

چھوٹا سا بڑا کیا ہے میں نے اسے اس کی رگ رگ سے واقف ہوں اسے جس چیز سے منع کرو وہی کام کرتا ہے۔۔۔۔۔

انہوں نے۔۔۔۔۔ مصلحت بھرا رویہ اپنایا تھا۔۔۔۔۔

البتہ اس تمام معاملے میں شہباز خان کی خاموشی کو سب سے پہلے مہر النساء نے نوٹ کیا تھا۔۔۔۔۔

ان کی اچانک سے یہ خاموشی اس کے لیے۔۔۔۔۔ حیران کن تھی۔۔۔۔۔

اور ان کی یہ خاموشی خود ان کے اپنے لیے بھی حیران کن تھی

اس لڑکی کے نقوش انھیں ماضی میں لے گئے تھے۔۔۔۔ اس کے نقوش کسی سے مماثلت رکھتے تھے۔۔۔۔

ماضی کی اتھاہ گہرائی یوں کے ساتھ بہت سے پرانے دکھ بھی تھے اذیت ناک یادیں۔۔۔۔۔ جہاں ایک پرانی بوسیدہ عمارت کے سامنے بیٹھ کے اس نے پہلی دفعہ اس حقیقت کا اقرار کیا تھا۔۔۔۔

جس سے وہ پچھلے چھ ماہ سے نظریں چرا رہے تھے۔۔۔۔۔
”مجھے لگتا ہے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔۔“

انہوں نے نظریں سامنے درخت پہ جماتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔
جو۔۔۔۔۔ ان کا دوست۔۔۔۔۔ یاور کرنٹ کھا کے پیچھے مڑا تھا۔۔۔۔۔

”کس کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔؟“

انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”ماہ جبین سے۔۔۔۔۔“

’وہ دن وزک سی اور دنی امی لہی تھ ا۔۔۔۔۔“

”شادی شدہ شخص کے منہ سے محبت کا اقرار اچھا نہیں لگتا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے چارپائی پہ بیٹھ کے حقا پیتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔۔۔۔۔

”وہ بیوی ہے میری۔۔۔۔۔“

وہ جیسے کسی خیال سے جاگا تھا۔۔۔۔۔

”بیوی نہیں ہے۔۔۔۔۔ بیوی تھی۔۔۔۔۔“

اس نے ہنس کے اسے یاد دلایا تھا

نوماہ کب کے گزر گئے یاد نہیں ہے طلاق دے آئے تھے اسے۔۔۔۔۔

اور یہ خیال ہی کس قدر اذیت ناک تھا۔۔۔۔۔

”میں نے اسے ان نوماہ میں ہر جگہ ڈھونڈا ہے یا اور وہ مجھے کہیں بھی نہیں ملی۔۔۔۔۔“

اس نے دکھ سے کہہ کے سر جھکا دیا تھا

”کھوئی ہوئی چیزیں پھر مل جاتی ہیں میرے بھائی اپنے ہاتھوں سے گنوائی چیزیں پھر
نہیں ملتی۔۔۔۔۔“

اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا

”مجھے لگتا ہے مجھے اس کی آہ لگی ہے میں اس سے کتراتا تھا ناب مجھے ہر جگہ وہ ہی دیکھائی
دیتی ہے۔۔۔۔۔“

”میں رات کو سو نہیں پاتا۔۔۔۔۔ ایسے لگتا ہے وہ کسی آسیب کی طرح میرے۔۔۔۔۔ ساتھ
ہے۔۔۔۔۔“

وہ ندامت بھرے لہجے میں اسے کہہ رہے تھے

وہ دونوں اس وقت یاور خان کے ڈیرے پہ بیٹھے تھے۔۔۔۔۔

”ابھی تک تو میری اولاد بھی پیدا ہو چکی ہوگی پتہ نہیں اس نے اسے میرے متعلق بتایا ہوگا
کہ۔۔۔۔۔“ نہیں۔۔۔۔۔“

اس نے ایک نظریا ور کو دیکھتے ہوئے آس بھرے لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔
”کم ظرفوں کو محبت کرنی نہیں آتی شہباز۔۔۔۔۔“

میں کہتا ہوں کمزور مردوں کو محبت نہیں کرنی چاہیئے وہ محبت کرنے کے اہل نہیں
ہوتے۔۔۔۔۔

جب وہ تمہارے پاس تھی تب وہ تمہیں چاہیئے نہیں تھی آج تم اسے چاہتے ہو وہ ہے
نہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے ملامت بھری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا تھا
”میں اس وقت نا سمجھ تھا۔۔۔۔۔“

اس نے کمزور لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔

”نہیں شہباز تم نا سمجھ نہیں تھے تم۔۔۔ مغرور تھے۔۔۔“

انہوں نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔۔۔۔۔

اور پھر حقا ایک طرف رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔۔۔

”جن چیزوں پہ ہمارا بس نہیں چلتا نا۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ سمجھو تا کر لینا چاہئے۔۔۔۔۔“

”تم کھو چکے ہو اسے۔۔۔“

ان الفاظوں کی گونج انہیں ابھی بھی۔۔۔۔۔ اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی

اور پھر وہ وہاں کھڑے نہیں ہو پائے تھے۔۔۔۔۔

چلے گئے تھے۔۔۔۔۔

سب نے ایک ساتھ سرگھما کے انہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔

دوسری طرف۔۔۔۔۔ وہ جب سے کمرے میں آئی تھی اس نے سر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔

وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے اس کے پاس آیا تھا۔۔۔۔۔

”زری۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔“ ”تم کچھ بول کیوں نہیں رہی۔۔۔۔۔“

اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی۔۔۔۔۔

اس کے ہمدرد نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا

وہ اس کے ساتھ لیٹ گئی تھی اس کے سینے کے ساتھ سر رکھ کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی

اس نے سختی سے اس کا کالر پکڑ رکھا تھا

اور وہ اس کی یہ حالت سمجھنے سے قاصر تھا

وہ اب نرمی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔۔۔۔
اور وہ اس تذبذب کا شکار تھی کہ اسے بتائے یا نہیں۔۔۔۔
اور وہ آخر اس نتیجے پہ پہنچی کہ ابھی ٹھیک وقت نہیں ہے۔۔۔۔
”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ ویسے ہی دل بھر آیا تھا۔۔۔۔
آنسو صاف کرتے ہوئے وہ زبردستی مسکرائی۔۔۔۔
پکانا۔۔۔۔۔“

اس نے مسکرا کے پوچھا تھا
تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔۔
وہ مطمئن بن تو نہیں ہوا تھا
پر کچھ سوچ کے خاموش ہو گیا تھا۔۔۔۔



موج در موج الجھنے کی ہوس بے معنی

ڈوبنا ہو تو سہارا نہیں دیکھا جاتا

”کیا ہوا ہے ساجدہ بیگم۔۔۔۔۔؟“

سب خیریت تو رہی ہے نا۔۔۔۔۔؟“

افتخار صاحب نے لکڑی کا بھاری دروازہ۔۔۔۔۔ دھکیل کے اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”مبارک ہو۔۔۔۔۔“ بیٹی ہوئی ی ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے خوشی سے بتایا تھا۔۔۔۔۔

”لیکن ایک بری خبر بھی ہے۔۔۔۔۔“

ان کے چہرے کی جوت بجھ گئی تھی۔۔۔۔۔

وہ ڈاکٹر صاحبہ کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ماہ جبین کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ پہلے سے ہی

ایک بیماری سے لڑ رہی ہے۔۔۔۔۔ اور یوں بھی وقت کم ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔

انہوں نے رازداری سے اپنے شوہر کو بتایا تھا

”اچھا یہ بات ابھی مت بتانا اسے۔۔۔۔۔ بچی تو دیکھاؤ ہمیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے بات ٹال دی۔۔۔۔۔

وہ اس وقت ماہ جبین کو دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔

انہوں نے۔۔۔۔۔ جھولے کے اندر۔۔۔۔۔ سے۔۔۔۔۔ بچی کو اٹھایا۔۔۔۔۔

”ماشا اللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔۔۔۔۔“

”بیڈ کرائون کے ساتھ ٹیک لگا کے۔۔۔۔۔ لیٹی۔۔۔۔۔ ماہ جبین نے پہلی دفعہ رخ موڑ کے

اس طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔

”دیکھو ماہ جبین اللہ نے تمہیں کتنی خوبصورت بچی دی ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے بچی کو ماہ جبین کی طرف بڑھایا۔۔۔۔۔

اس نے۔۔۔۔۔ سہمی ہوئی نظروں سے افتخار صاحب کی طرف دیکھا تھا

پھر کانپتے ہاتھوں سے بچی کو اٹھایا تھا
سختی سے آنکھیں میچ لی تھی۔۔۔۔۔

جب اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا تھا تو ایک سکھ بھری سانس اس نے خارج کی۔۔۔۔۔
وہ واقعی ہی بہت خوبصورت تھی۔۔۔۔۔

اس نے سارے نین نقوش اپنے باپ کے ہی چرائے تھے آج بہت وقت بعد۔۔۔۔۔ اسے
شہباز خان یاد آیا تھا۔۔۔۔۔

اور ساتھ ہی وہ ایک فیصلے پہ پہنچی تھی

انہوں نے سر اٹھا کہ۔۔۔۔۔ دونوں کے مسکراتے چہروں کی طرف دیکھا ایک لمحے کے لیے
اس کا دل چاہا وہ اپنا فیصلہ بدل ڈالے۔۔۔۔۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے سر جھکا کے کہا تھا

تو دونوں میاں بیوی اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔۔۔۔

میں آپ لوگوں کی خوشیوں کی قدر کرتی ہوں۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کا مجھ پہ بہت احسان ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ میری موت کے بعد یہ بچی آپ اس کے باپ کے حوالے کر دیں۔۔۔۔۔

اس نے نظر چرا کے کہا تھا

لیکن دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کے رہ گئے تھے۔۔۔۔

”خوشی کے موقع پہ ایسی بات نہیں کرتے ہیں۔۔۔۔“

انہوں نے اسے ٹوکا تھا۔۔۔۔۔

”حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگ بھی جانتے

ہیں۔۔۔۔۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ کینسر مجھے اندر ہی اندر

ختم کر رہا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے دکھ سے کہا تھا

”بس میری یہ خواہش ہے کہ میری موت کے بعد میرے سابقہ پتے پہ

میری۔۔۔۔۔ دوست سفینہ کے حوالے کر دیجیئے گا آپ اسے۔۔۔۔۔ وہ خود اسے

اس کے باپ کے حوالے کر دے گی۔۔۔۔۔“

اس نے التجا کی تھی۔۔۔۔۔

”لیکن ہم پال سکتے ہیں اسے۔۔۔۔۔ ہمارے اوپر بوجھ نہیں ہے یہ۔۔۔۔۔“

ساجدہ بیگم نے اپنے حق میں صفائی دی تھی

خالہ جان۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کی خلوص نیت پہ مجھے کوئی شک

نہیں ہے۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔

یہ اس کی ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔“

اس نے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔

تو دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔۔۔۔۔



اشک اپنا کے تمہارا نہیں دیکھا جاتا

ابر کی زد میں ستارہ نہیں دیکھا جاتا

شام کے گہرے سائے بھی اس حویلی کی خاموشی کے سکوت کو توڑ نہیں پائے تھے سب لوگ

اپنے کمروں میں چھپے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔

وہاج۔۔۔۔۔ زرپاش کے اور اپنے کپڑے۔۔۔۔۔ الماری میں سیٹ کر رہا تھا

اور زرپاش واش روم میں تھی۔۔۔۔۔

اس نے زرپاش کے بیگ میں رکھا۔۔۔۔۔ آخری سوٹ نکالا تو۔۔۔۔۔ کوئی تصویر بھی زمین

بوس ہوئی تھی

اس نے جھک کے ذمین پہ پڑی تصویر اٹھائی
موڑ کے دیکھا تو۔۔۔۔۔ وہ شاک ہو گیا۔۔۔۔۔
وہ کتنی ہی دیر نظریں جما کے نا سمجھی سے اس تصویر کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔
زرپاش تو لیے سے منہ صاف کرتی۔۔۔۔۔ واش روم سے نکلی تو وہاں کو یوں تصویر پکڑ کے
کھڑا دیکھ کے وہ گنگ رہ گئی۔۔۔۔۔
”یہ تصویر تمہارے پاس کیا کر رہی ہے۔۔۔۔۔؟“
اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔
وہ خاموش رہی۔۔۔۔۔
”تم سے پوچھ رہا ہوں زری۔۔۔۔۔ چچا جان کی تصویر تمہارے پاس کیا کر رہی ہے۔۔۔۔۔؟“
وہ قدم قدم چلتا اس کے پاس آیا۔۔۔۔۔ اور تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی وہ
خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔۔۔۔۔

”زری کیا رشتہ ہے تمہارا ان کے ساتھ۔۔۔۔۔؟“

اس کو خاموش پا کے وہ دھاڑا۔۔۔۔۔

”باپ ہے میرا یہ۔۔۔۔۔“

بد قسمتی سے بیٹی ہوں میں اس شخص کی

وہ بھی اتنی ہی اونچی آواز سے دھاڑی تھی۔۔۔۔۔

تو تصویر وہاں کے ہاتھ سے۔۔۔۔۔ گر گئی تھی۔۔۔۔۔

وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ کے رہ گیا۔۔۔۔۔

”کیا۔۔۔۔۔؟“ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔۔۔؟“

وہ بے یقینی سے بولا تھا۔۔۔۔۔

”ہاں یہی سچ ہے اور یہی حقیقت یہی وہ حقیقت ہی جس کی وجہ سے اماں جان کا انتقال

ہوا۔۔۔۔۔۔۔ یہی وہ حقیقت ہے جو آخری وقت پہ وہ تمہیں بتانا چاہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔“

بات کرتے کرتے اس کا سانس پھول گیا تھا

ایک سیکنڈ میں اس کے ذہن میں وہ بات کلک ہوئی تھی کہ جس دن جہاں آرا کا انتقال ہوا

تھا اس دن۔۔۔۔۔ وہ شہباز خان کے ساتھ ہی تو تھا۔۔۔۔۔

”یہی سوچ کے اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔۔۔۔۔

”ایسا کیسے ممکن ہے تم چچا جان کی بیٹی کیسی ہو سکتی ہو۔۔۔۔۔“

وہ ابھی تک یہ بات ماننے سے انکاری تھا۔۔۔۔۔

زرپاش نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

یہ وہ بندہ تھا جو آنکھ بند کر کے اس کی ہر بات پہ یقین کر لیتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن آج وہ کچھ بھی

ماننے پہ تیار نہیں تھا۔۔۔۔۔

”اس بات کا جواب تو تمہیں تمہارے چچا جان ہی دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔۔۔۔۔

تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا تھا کچھ دیر وہ زرپاش کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کے۔۔۔۔۔ کچھ سوچتا رہا
پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے۔۔۔۔۔ کمرے سے باہر لے گیا۔۔۔۔۔
ایک ہاتھ میں۔۔۔۔۔ وہ تصویر تھی۔۔۔۔۔
”مکدھر لے کے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“
اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔
”چلو میرے ساتھ۔۔۔۔۔“
جو بھی حقیقت ہے وہ سامنے آجائے گی۔۔۔۔۔
اس کی گرفت اس کے ہاتھ پہ اور مضبوط ہو گئی تھی
”مانتا ہوں۔۔۔۔۔ زری تم میری بیوی ہو۔۔۔۔۔ لیکن میں رشتوں میں توازن رکھنے کا
قائل ہوں۔۔۔۔۔“ اگر تمہاری یہ بات الزام ہوئی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔“
اس نے چھتے ہوئے لہجے میں کہا

تو زری اس کے الفاظوں پہ غور کر کے رہ گئی

کتنی جلدی یہ انسان چھوڑنے کی بات کر دیتا تھا۔۔۔

”اور اگر میں سچی نکلی تو۔۔۔۔۔؟“

اس نے۔۔۔۔۔ بظاہر پر سکون لہجے میں پوچھا تھا۔۔۔

پھر پلٹا تھا۔۔۔

”تو یہاں موجود ہر ایک انسان اور خود وہ شخص تم سے معافی مانگے گا۔۔۔۔۔“

اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا تھا

پھر اس نے خود کو کسی بے جان چیز کی طرح۔۔۔ خود کو وہاں کے سپرد کر دیا تھا۔۔۔

اس نے سیڑھیاں اترتے ہی سب کو آوازیں دینا شروع کر دیا تھا

تھوڑی ہی دیر بعد تقریباً سب لوگوں کے ہی جھنجھلائے ہوئے چہرے نمودار ہوئے تھے۔۔۔

سب سے آخر میں شہباز خان ستے ہوئے چہرے کے ساتھ۔۔۔۔۔ کمرے سے باہر نکلے
تھے۔۔۔۔۔

زرپاش کا ہاتھ یوں پکڑے دیکھ کے ان کے چہروں پہ جھنجھلاہٹ کی جگہ اب۔۔۔۔۔ سوالوں
کے جال نے لے لی تھی۔۔۔۔۔

لیکن وہاں جارحانہ نظروں سے۔۔۔۔۔ شہباز خان کو دیکھ رہا تھا
جو خود معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔۔

”گلتا ہے بہت جلدی آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

انہوں نے زرپاش کا یوں ہاتھ پکڑے دیکھ کے۔۔۔۔۔ استہزائی یہ ہنسی کے ساتھ کہا
تھا۔۔۔۔۔

اس کے تاثرات سخت ہوئے تھے۔۔۔۔۔

”مرد ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں تھا کرتے۔۔۔۔۔“ مگر لفظ مرد قابلِ غور ہے دادا جان

اس نے کاٹ دار لہجے میں انہیں جتایا تھا۔۔۔۔

”اور دادا جان آپ نے کیا تمام عمر۔۔۔۔ لوگوں کے بچوں پہ ہی نظر رکھی ہے۔۔۔۔۔۔ یا

اپنے بچوں کی رنگین مزاجیوں کو بھی پرکھا ہے۔۔۔۔“

اس نے بھی شہباز خان کی طرف دیکھ کے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔۔۔۔

”شہباز خان نا سمجھی سے اس کا طنز سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے

مہر النساء اور رضیہ کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔۔۔۔

جب کے ”ہانیہ ثانیہ“ اکتا کے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

صرف رجب خان کے تاثرات سخت تھے۔۔۔۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہو۔۔۔۔“؟ کھل کے بولو۔۔۔۔۔

میر داد مدعے پہ آئے تھے۔۔۔۔

”یہ اپنے بیٹے سے۔۔۔۔ پوچھیئے نا۔۔۔۔؟“

اس نے شہباز خان کی طرف اشارہ کر کے۔۔۔۔۔ سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔
”میں کیا بتاؤں۔۔۔۔۔“

وہ نا سمجھی سے بولے تھے۔۔۔۔۔

”کیا رشتہ ہے آپ کا زریپاش سے۔۔۔۔۔؟“

اس نے۔۔۔۔۔ پر سکون لہجے میں سب کے ہوش اڑادیئے تھے

سب نے ایک ساتھ سراٹھا کے زریپاش کی طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔

شہباز۔۔۔۔۔ خان۔۔۔۔۔ کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا

وہ جھٹلانا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ کہ اسی لمحے ہوا میں اچھالی گئی تصویر نے ان کی خوش فہمی ہوا کی
تھی

وہ لڑکھڑائے تھے۔۔۔۔۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔۔۔۔۔

انہوں نے بے یقین نگاہیں اٹھا کے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔۔۔۔۔

جوزخمی نگاہوں سے۔۔۔۔۔ ان کی طرف ہی دکھ رہی تھی

یہ وہ حقیقت تھی۔۔۔۔۔ جسے وہ کئی سال پہلے ایک ویرانے میں چھوڑ آئے

تھے۔۔۔۔۔ پھر پلٹ کے ان کے ہی سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔۔

لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ اس وقت اپنے باپ کا گریبان پکڑ

کے۔۔۔۔۔ اسے روک نہیں سکتی تھی اور آج وہ گریبان پکڑ کے سوال کر سکتی تھی گزرے

دنوں کا حساب مانگ سکتی تھی۔۔۔۔۔

میرداد۔۔۔۔۔ کے سر پہ جیسے پوری حویلی ہی آن گری تھی۔۔۔۔۔

”رجب خان کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔۔۔۔۔

”مہر النساء نے کچھ گھبرائی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا تھا

یہ وہ لڑکی تھی۔۔۔۔۔ جسے انہوں نے یہ سوچ کے قبول نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ کہ یہ کاٹھا ہمیشہ
کے لیے ان کی زندگی سے نکل جائے لیکن یہ۔۔۔۔۔ حقیقت آج۔۔۔۔۔ ان کے سامنے کھڑی
تھی تو انہیں لگا۔۔۔۔۔ وہ گزرے بائی یس سال محض دھوکہ تھا۔۔۔۔۔
”ہانیہ اور ثانیہ“ فق رنگت کے ساتھ اپنے باپ کی جانب دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔
”وہاں سمیت سب اعتراف کے۔۔۔۔۔ منتظر تھے
”سوائے ان تین لوگوں کے جو اس حقیقت کو جانتے تھے۔۔۔۔۔“
”میرداد خان۔۔۔۔۔ رجب خان۔۔۔۔۔ مہر النساء۔۔۔۔۔“
رضیہ الجھی ہوئی ی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی اسے اس حقیقت سے دور رکھا گیا
تھا۔۔۔۔۔
”بتائی یئے چچا جان۔۔۔۔۔“؟ کیا اس بات میں حقیقت ہے۔۔۔۔۔“؟

وہاں خود بھی بہت تکلیف میں تھا اس لیے ناچاہتے ہوئے بھی وہ قدرے اونچی آواز میں
دھاڑا۔۔۔۔۔

مہر النساء نے کچھ اس امید سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے وہ نہ کر دیں گے
پھر وہ لڑکی ان کی آنکھوں کے سامنے سے دفعہ ہو جائے گی۔۔۔۔۔

اور شہباز خان کو بے ساختہ وہ دن یاد آیا تھا۔۔۔۔۔

جس دن سفینہ نے پہلی بار۔۔۔۔۔ شہباز خان کی گود میں ننھی سی بچی کو ڈالا تھا
کتنی ہی دیر تو وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔۔۔۔۔

انہوں نے اس سے خوبصورت بچی اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔۔۔۔۔
”ماہ جبین اسے مجھے دینے پہ کیسے رضامند ہو گئی۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے نظر چراکے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”جو دنیا میں۔۔۔۔۔ ہے ہی نہیں وہ رضامند کیسے ہوتی۔۔۔۔۔“

اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے جیسے ان کی سماعتوں پر بم پھوڑا

تھا۔۔۔۔

”کیا کیسے۔۔۔۔؟“

ان کے منہ سے بے ربط جملے نکلے تھے۔۔۔۔

”آپ بھی پوچھ رہے ہیں کیسے۔۔۔۔؟“

وہ اپنا طنز نہ چھپا سکی۔۔۔۔۔ جو بھی تھا وہ اپنی سہیلی کا قاتل سمجھتی تھی۔۔۔۔

”ایسے مت کہیں میری بیوی تھی وہ۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے التجائی یہ لہجے میں کہا۔۔۔۔

”بہت جلدی نہیں یاد آگیا ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟“

وہ طنز سے بولی تھی۔۔۔۔

”میں بہت شرمندہ ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے ندامت سے سر جھکا دیا تھا۔۔۔۔

”آپ کی اس ندامت کا کوئی ی فائی دہ نہیں۔۔۔۔ آپ کی محبت کے ناسور کو بلڈ کینسر کا نام

دے کے وہ۔۔۔۔ آپ کی زندگی سے چلی گئی وہ۔۔۔۔“

وہ روہانسی ہوئی۔۔۔۔

اعلیٰ ظرف عورت تھی اور صابر بھی۔۔۔۔ ”تب ہی اپنی بیٹی آپ کو سونپ

گئی۔۔۔۔“

اس نے ایک گھر اسانس لیا

”آج صبح ہی سفینہ کی فون کال کے بعد وہ بھاگے بھاگے۔۔۔۔ مری پہنچے تھے۔۔۔۔ اس آس پہ

کہ شاید ماہ جبین انہیں مل جائے

لیکن اس خبر نے ان کا چین و سکون غارت کر دیا تھا

وہ بجھے دل کے ساتھ اپنی بیٹی کو لے کے اس گھر سے نکلے تھے

اس دن انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ۔۔۔۔۔ وہ اپنے گناہوں کا مداوا اس بچی کی اچھی پرورش کر کے کریں گے۔۔۔۔۔

”لیکن۔۔۔۔۔ وہ اس فیصلے پہ بھی قائل نہیں رہ پائے تھے۔۔۔۔۔

وہ اپنے باپ بھائی اور بیوی کے سامنے کمزور پڑ گئے تھے

وہ پھر ایک دفعہ اس بچی کی حق تلفی کر گئے تھے۔۔۔۔۔

پتہ نہیں وہ ان کی اولاد تھا یا ان کا ظلم تھا جو ان کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔۔۔

ہوش انہیں تب آیا جب وہاں کی چنگاڑتی ہوئی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی

انہوں نے ایک نظر نیچے پڑی تصویر پہ ڈالی۔۔۔۔۔

پھر تڑپ کے زرپاش کی طرف بڑھے۔۔۔۔۔

مہر النساء کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔۔۔

”میری بچی۔۔۔۔۔“

انہوں نے اسے گلے لگانا چاہا تو وہ کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹی۔۔۔۔

اب اور کوئی اعتراف نہیں چاہیئے تھا وہاں ج۔۔۔۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔۔۔۔

اس کب کیسے کا نہیں پتہ تھا وہ اتنا جان گیا تھا کہ جو لڑکی اس کی بیوی ہے وہ اسی کا خون

ہے۔۔۔۔

زرباش اس کے پیچھے چھپ گئی تھی۔۔۔۔

میرداد کے چہرے پہ سختی واضح تھی وہ جو اس لڑکی سے جان چھڑانے کے چکروں میں تھے اب

یہ بلا ان کے سر پہ ہی مسلط ہونے لگے تھی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔۔۔۔

”پہلے تو پھر کوئی گنجائش بچتی تھی اب تو اس عورت کو ایک سیکنڈ بھی اس گھر میں برداشت

نہیں کروں گا۔۔۔۔“ ”طلاق دو اسے۔۔۔۔“

انہوں نے رعب دار لہجے میں کہا تھا

”مت بھولی مے باباجان یہ آپ کی بھی پوتی ہے۔۔۔۔۔“

اس دفعہ یاد دہانی کروانے والے شہباز خان تھے۔۔۔۔۔

”میرداد نے ایک ابرواٹھا کے طنزیہ نظروں سے انہیں گھورا

جیسے کہہ رہے ہو“ بڑی جلدی خیال نہیں آگیا تمہیں۔۔۔۔۔

وہاج کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے

مہرالنسا ناگواری سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

”مجھے اپنی بیٹی کو دیکھنے تو دو۔۔۔۔۔“

انہوں نے تڑپ کے التجا کی تھی۔۔۔۔۔

”آپ جیسے باپ کو بیٹی کو دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہوتا آپ کس منہ سے مجھے بیٹی کہہ رہے ہیں

وہی بیٹی جسے۔۔۔۔۔ آپ بے آسرا سڑک کے کنارے پھینک آئے تھے۔۔۔۔۔“

وہ وہاج کو پیچھے کرتی زخمی شیرنی کی طرح ان کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

میں مجبور تھا اس وقت۔۔۔۔۔“

انہوں نے کمزور سی صفائی دی تھی۔۔۔۔۔

”مجبوری کوئی نہیں ہوتی شہباز خان۔۔۔۔۔“ اگر رشتہ بنانے کی چاہ ہو تو مجبوری کچھ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

وہ زخمی لہجے میں بول کے ان کو ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہی تھی۔۔۔۔۔

”ایسے مت کرو۔۔۔۔۔ میں نے اتنے عرصے بہت سزا بھگتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ مسلسل التجا کر رہے تھے۔۔۔۔۔

”آپ نے سزا بھگتی ہے میں نے سزا بھگتی ہے۔۔۔۔۔ آپ کی دھتکاری ہوئی بیٹی ایک

کوٹھے میں پلی بڑھی ایک طوائف کے ہاتھوں آپ جیسے مردوں اور آپ جیسے لوگوں سے تو

ہزار درجہ بہتر۔۔۔۔۔“ ایسی طوائفیں ہوتی ہیں جو آپ جیسے لوگوں کے گناہوں کو چھپا

لیتی ہیں۔۔۔۔۔“

وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے انہیں آئی نہ دیکھا رہی تھی
جس کا اثر سوائے شہباز خان کے اور کسی پر نہیں ہو رہی تھی۔۔۔
”مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔“ میں انسان ہوں غلطی ہو گئی مجھ سے۔۔۔۔۔
انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے التجا کرنے کی کوشش کی جو اس نے سختی سے چھڑا لیا
”مر کے بھی نہیں۔۔۔۔۔“ کروں گی معاف۔۔۔۔۔
پتہ نہیں دوسروں کے ساتھ۔۔۔۔۔ ظلم کرتے وقت ہم۔۔۔۔۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ
سامنے والا بھی انسان ہے اور جب خود پہ ظلم ہوتا ہے تو فٹ سے یاد آ جاتا ہے کہ ہم انسان
ہیں۔۔۔۔۔
وہ سخت مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ کے۔۔۔۔۔ وہاں کی طرف مڑی
اس کی نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ وہاں کو کچھ غلط ہونے کا اندازہ ہوا۔۔۔۔۔
لیکن تب تک وہ سیڑھیاں چڑھ چکی تھی۔۔۔۔۔

باقی سب لوگ خاموش تماشائی ی تھی
وہاں بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔۔۔۔۔



خوبصورت اونچی بلڈنگ میں رات کے اس پہر اچھی خاصی رش تھی۔۔۔۔۔ اس ہوٹل کا شمار
دنیا کے بہت بڑے اور مہنگے ہوٹلز میں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت شہر کے امیر کبیر
لوگ۔۔۔۔۔ یہاں اپنا دل بھلانے آتے تھے۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔ کاؤنٹر پہ بہت
سے سفید گلاس پڑے تھے۔۔۔۔۔ اور پاس مختلف بوتلیں جس میں۔۔۔۔۔ عجیب رنگ کا
کوئی ی مشروب چھلک رہا تھا۔۔۔۔۔
مدہم روشنی میں مختلف ٹیبلز پہ لوگ خاموشی سے کھانے پینے میں اور خوش گپیوں میں مصروف
تھے۔۔۔۔۔

”ایسے میں۔۔۔۔۔۔ وہ لال رنگ کی پاؤں کو چھوتی میکسی زیب تن کیے۔۔۔۔۔۔ بالوں کا
اونچا جوڑے بنائے تھی ہوئی گردن کے ساتھ۔۔۔۔۔۔ کسی ملکہ کی طرح بیٹھی
تھی۔۔۔۔۔۔“

آنکھوں میں عجیب سا تفاخر تھا۔۔۔۔۔۔

اس نے ایک اداسے۔۔۔۔۔۔ سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔

جو کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں۔۔۔۔۔۔ کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھے ہوئے
تھے۔۔۔۔۔۔

سفید بالوں کو کنگی کے ساتھ پیشے کی طرف سیٹ کر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔

”مجھے یہاں دعوت دینے کی کوئی خاص وجہ۔۔۔۔۔۔“ اس نے کانوں میں لٹکتے ٹاپس کو

چھوتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ ذرا مغرور لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔۔

”اچھا اب ہمیں بھی۔۔۔۔۔۔ آپ سے ملنے کے لیے ٹائیملینا پڑے گا۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔۔۔۔

”وقت کی بات تو نہیں۔۔۔۔۔ خیر جو بھی ہوں جہاں بھی ہوں آپ کی ہی وجہ سے

ہوں۔۔۔۔۔“ آپ نے ہی مجھے کوٹھے سے اٹھا کے ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ بنایا

۔۔۔۔۔ میرا سارا وقت آپ کا ہی تو ہے۔۔۔۔۔“

اس نے تشکرانہ لہجہ اپنایا۔۔۔۔۔

”دیکھ لیں آپ کی وجہ سے ہی میں نے وہاں جیسے بندے کے ساتھ بھی بگاڑ دی۔۔۔۔۔“

انہوں نے گلاس لبوں کے ساتھ لگاتے ہوئے احسان جتایا تھا۔۔۔۔۔

”نوازش جناب آپ کی۔۔۔۔۔“ لیکن۔۔۔۔۔ یہ بھی تو دیکھیئے کہ آپ کی لڑائی میں

ہمارا بھلا ہوا ہے کون سا ہماری وجہ سے بگاڑی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے نظروں میں تپش لے کے۔۔۔۔۔ جتا کے کہا تھا

تو وہ ہنس دیئے تھے۔۔۔۔۔

”اور اگر ہم کہیں کہ۔۔۔۔۔ آپ کی وجہ سے بگاڑی ہے ہم نے۔۔۔۔۔؟

انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔۔۔۔۔

اس نے نظر اٹھا کہ۔۔۔۔۔ ایک نظر ستائی شئی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے خوبو شخص کو دیکھا

جس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔۔۔۔۔

”شادی کریں گی مجھ سے۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے ایک مخملی ڈبیہ اس کی طرف بڑھائی تو۔۔۔۔۔ وہ شاکڈ ہو گئی۔۔۔۔۔



وہ سڑھیاں چڑھ کے سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔۔۔۔۔

سامنے وہ غصے سے الماری کھول کے۔۔۔۔۔ اپنے سارے کپڑے نکال رہی تھی۔۔۔۔۔ اور

بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔۔۔۔۔

”کہاں جا رہی ہو تم۔۔۔۔۔؟“

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔۔۔۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔۔۔۔۔

”تم سے پوچھ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ ”کدھر جا رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے اس کی کلائی کی پکڑ کے اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔۔۔۔۔

”چھوڑیں مجھے۔۔۔۔۔ میں آپ جیسے شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اس گھر میں ہی نہیں

رہنا چاہتی۔۔۔۔۔“

اس نے تیزی سے اپنی کلائی کی اس کی گرفت سے آزاد کروائی تھی

”آپ بھی نکلے نا اپنے چچا جیسے۔۔۔۔۔“ ”کتنی آسانی سے کہہ دیا۔۔۔۔۔ کہ میں تمہیں

طلاق دے دوں گا یعنی آپ کے وہ سارے دعوے وہ وعدے جھوٹے تھے۔۔۔۔۔“ ”کبھی

سوچا ہے جس وقت آپ چھوڑنے کی بات کرتے ہیں میرے دل پہ کیا گزرتی ہے۔۔۔۔۔“

وہ زخمی لہجے میں بولتے ہوئے استہزائی یہ ہنسی۔۔۔۔

وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا

اس نے اپنا آخری سوٹ جو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہاں نے ہی اسے دلایا تھا ڈالا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بیگ

گھسیٹتی ہوئی ی باہر نکلنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا

سڑھیوں کے بالکل قریب پہنچ کے اس نے اسے بازو سے پکڑ کے اپنے قریب کیا تھا۔۔۔۔۔

”تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی تم مجھے چھوڑ کے نہیں جاسکتی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ادھر میری

آنکھوں میں دیکھو کیا تمہیں یہ نظر نہیں آتا تم نے اپنے سامنے کھڑے شخص کا غرور ایک

نظر میں پاش پاش کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا کہیں بھی تمہیں محبت کی رمک دیکھائی نہیں

دیتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا کہیں بھی تمہیں یہ دیکھائی نہیں دیتا کہ تم چھوڑ کے جاؤ گی تو مر جاؤں گا

میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟“

اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شکست خور لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔

زرباش کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھی

دل ایک بار پھر بغاوت پہ اتر آیا تھا۔۔۔۔

اس نے خود کو آزاد کروایا تھا۔۔۔۔۔

”مجھے۔۔۔۔۔ آپ میں اس وقت۔۔۔۔۔ صرف ایک بے اعتبار انسان نظر آرہا ہے۔۔۔۔۔“
”سچ پتہ چلنے پہ تو سب ہی اعتبار کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن مزاتب آتا ہے
۔۔۔۔۔ جب۔۔۔۔۔ پوری دنیا آپ کے خلاف ہو اور آپ کا محرم آپ کا یقین
کرے۔۔۔۔۔“

وہ ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوئی تھی

اور وہاج کو ذندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ پلٹ کے اب نہیں آئے گی

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر چکی تھی۔۔۔۔

نیچے حویلی ویران تھی۔۔۔۔

وہ اسے روکنے کے لیے پیچھے بھاگا تھا۔۔۔۔۔

تیسری سیڑھی پہ اس کا پاؤں اٹا ہوا تھا پھر ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ وہ اپنا توازن نہ برقرار رکھتے ہوئے کسی چیز کی طرح بل کھاتا سیڑھیوں سے ہوتا ہوا زمین کی طرف آیا

تھا۔۔۔۔۔ اس کا سر زمین کے ساتھ بری طرح ٹکرا آیا تھا۔۔۔۔۔

یکدم پیچھے مڑتی زرباش-----کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی تھی

آخری چیز جو زریاش نے دیکھی تھی وہ وہاج کا خون آلودہ چہرہ تھا۔۔۔۔۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

جیسے سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملے۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں حویلی کے اس سکوت کو۔۔۔۔۔ زیرپاش کی دل سوز چیخوں کی آواز نے

توڑا۔۔۔۔۔ وہ کسی جنونی انسان کی طرح وہاج کی طرف بڑھی تھی۔۔۔۔۔ آواز سن کے

سب لوگ کمرے سے نکلے تھے اور ان کی رنگت فق ہوئی تھی۔۔۔۔۔ سب کے چہرے

کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔۔۔۔۔ زرباش نے۔۔۔۔۔ آگے بڑھ کے۔۔۔۔۔ وہاں کا سر
اپنی گود میں رکھا تھا جو بالمشکل سانس لے رہا تھا اس کی سانسوں کی رفتار کافی مدہم
تھی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔۔۔۔۔ زرباش کے چہرے پہ موت کی سفیدی چھا گئی
تھی۔۔۔۔۔

وہاج کی آنکھیں بند تھی اور اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید تھا۔۔۔۔۔

زرپاش نے۔۔۔۔۔ وحشت زدہ نظروں سے اپنے پاس کھڑے۔۔۔۔۔ میرداد کو دیکھا تھا جن کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔۔۔۔۔

رجب جلدی سی۔۔۔۔۔ڈرائی یور کو گاڑی نکالنے کی تلقین کر رہے تھے۔۔۔۔۔

”وہاج۔۔۔۔۔آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔پلیز آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔“

اس کے سفید کپڑے لال ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ اس کا چہرہ تھپتھا رہی تھی۔۔۔۔۔

رضیہ کسی بت کی طرح کھڑی تھی۔۔۔۔۔

شہباز خان کے چہرے پہ عجیب بے بسی کے رنگ تھے۔۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر بعد۔۔۔۔۔ وہاج کو۔۔۔۔۔ گاڑی میں بیٹھایا گیا۔۔۔۔۔

گاڑی کا رخ اب شہر کی طرف تھا

اور اپنی گود میں رکھے وہاج کے خون آلودہ سر کو دیکھتے ہوئے وہ۔۔۔۔۔ عجیب بے بسی کا شکار تھی۔۔۔۔۔

گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اور ساتھ فرنٹ سیٹ پہ۔۔۔۔۔ سنجیدہ چہرہ لیے رجب خان

تھے۔۔۔۔۔

میرداد اور باقی سب لوگ۔۔۔۔۔ دوسری گاڑی میں پیچھے سے آرہے تھے۔۔۔۔۔

آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہہ کے وہاج کے چہرے پہ گر رہے تھے

تو اس کی پلکوں کی جنبش سے وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔۔۔۔۔

تھوڑی ہی دیر بعد۔۔۔۔۔ وہ راولپنڈی۔۔۔۔۔ کے قاضی دا عظم ہاسپٹل۔۔۔۔۔ کے باہر
تھے۔۔۔۔۔

جلدی سے۔۔۔۔۔ وینٹی لیٹر لایا گیا۔۔۔۔۔ اس کا وجود اس پہ رکھ کے جب اسے آگے کی
طرف لے کے گئے تو زری بھی دیوانہ وار پیچھے بھاگی تھی۔۔۔۔۔
رجب خان نے۔۔۔۔۔ بھی اس طرف گئے تھے۔۔۔۔۔

وہ وینٹی لیٹر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔۔۔۔۔
اس کو آپریشن ٹھیسٹر میں لے کے جانے لگے تو زری پاش بھی پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے
بھاگی۔۔۔۔۔

جب کسی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کے روکا
اس نے پلٹ کے دیکھا تو وہ رجب خان تھے جن کے اپنے چہرے پہ بھی دکھ واضح تھا۔۔۔۔۔
”میرا وہاں۔۔۔۔۔“

اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔

انہوں نے آگے بڑھ کے اسے اپنے ساتھ لگالیا تھا۔۔۔۔۔

صبر کرو میری بچی۔۔۔۔۔ اللہ پہ یقین رکھو کچھ نہیں ہوگا اسے۔۔۔۔۔“

انہوں نے ضبط سے ہی سہی اسے حوصلہ دیا تھا۔۔۔۔۔

اسی لمحے سب ادھر پہنچے تھے۔۔۔۔۔

سب زرپاش کو تو بھول گئے تھے انہیں بس اب وہاں یاد تھا۔۔۔۔۔

میرداد اور مہر النساء نے کچھ ناگواری سے یہ منظر دیکھا تھا۔۔۔۔۔

جب کہ رضیہ تڑپ کے۔۔۔۔۔ رجب کی طرف بڑھی تھی۔۔۔۔۔

”کیسا ہے میرا بیٹا۔۔۔۔۔؟“

وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔۔۔۔۔

ان سب میں صرف شہباز خان تھے جن کی نظروں میں ملال تھا۔۔۔۔۔ کچھ دکھ
پچھتاوا۔۔۔۔۔ اور کم تری کا احساس۔۔۔۔۔

اگر وہ اس دن زری کو چھوڑ نہ آتے تو اس وقت۔۔۔۔۔ رجب کی جگہ وہ ہوتے۔۔۔۔۔
اسی سوچ نے ایک دفعہ پھر انہیں اندر سے توڑ دیا تھا۔۔۔۔۔

وہاں کو سر پہ بہت گہری چوٹیں آئی تھیں اور اس کا خون بھی کافی بہہ گیا تھا۔۔۔۔۔
اس وقت وہ مکمل بے ہوشی میں تھا

ڈاکٹر بار بار انہیں دعا کی تلقین کر رہے تھے

اور زری اور رضیہ کا رورو کے برا حال تھا۔۔۔۔۔

وہ دونوں۔۔۔۔۔ کرسیوں پہ۔۔۔۔۔ بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ زری کو انہوں نے ساتھ لگا
رکھا تھا۔۔۔۔۔ کافی دیر رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں لال ہو چکی تھیں۔۔۔۔۔ اب وہ

خالی خالی نظروں سے اس وارڈ کے دروازے کو دیکھ رہی تھی جس میں وہاں تھا۔۔۔۔۔ جبکہ رضیہ ابھی بھی بے آواز رو رہی تھی

وہ دونوں اس طرح بیٹھی تھی جیسے دونوں کی صدیوں کی آشنائی ہو۔۔۔۔۔

وہ جو یہ سوچ کے بیٹھی تھی کہ وہ اس لڑکی کو کبھی قبول نہیں کریں گی۔۔۔۔۔ اور اپنی ذہن میں۔۔۔۔۔ خود سے اس کے لیے رائے قائم کر لیتی تھی اسے ایک نظر دیکھتے ہوئے ہی وہ بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ لڑکی جس کے بارے میں وہ یہ سوچ کے بیٹھی تھی کہ تیز طراز ہوگی۔۔۔۔۔ ان کی قیاس آرائی ہی ثابت ہوئی تھی۔۔۔۔۔ وہ اس بات پہ۔۔۔۔۔ یقین رکھتی تھی کہ جو خود مظلوم ہو۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ کسی پہ ظلم کرتے ہوئے بھی لاکھ دفعہ سوچتا ہے۔۔۔۔۔ جس لڑکی کے اپنے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوا

تھا۔۔۔۔۔ وہ کیسے ان کے بیٹے کو چھین سکتی تھی۔۔۔۔۔ باقی رہی سہی کسر وہاں والے واقعے نے ختم کر دی تھی۔۔۔۔۔ ان کے دل میں رہا سہا وہم بھی ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ زرباش کا جنون ان

سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ وہ فطرتاً بری نہیں تھی نہ دل میں میل رکھنے والی عورت
تھی۔۔۔۔۔۔ تھوڑی مغرور تھی جس کے بل بوتے پہ انہوں نے زرخیز کو برا بھلا کہا
تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن اب وہ اسے دل سے قبول کر چکی تھی۔۔۔۔۔۔
رجب خان کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے جو بھی تھا وہاں ان کی اکلوتی اولاد
تھی۔۔۔۔۔۔ اور ان کی جان تھی اس میں اولاد اگر کچھ غلط بھی کر دے تو ماں باپ کہا اولاد سے
منہ موڑ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔
اس سارے معاملے میں تین نفوس نے مکمل چپ سادھ رکھی تھی۔۔۔۔۔۔ شہباز
خان۔۔۔۔۔۔، میر داد، اور مہر النساء۔۔۔۔۔۔
جن کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔۔۔۔۔۔
تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر باہر نکلے تو زرخیز تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھی۔۔۔۔۔۔
”وہاں کیسے ہیں۔۔۔۔۔۔؟“

اس نے بے تابی سے پوچھا تھا

”پیشنت کا خون کافی بہہ گیا ہے انہیں اونیکسٹوبلڈ کی بہت اشد ضرورت ہے آپ جلدی سے

خون کا انتظام کریں ہم انہیں بچانے کی مکمل کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کہتے ہوئے آخر میں انہیں تسلی دی تھی۔۔۔۔۔

”میرا ہے اونیکسٹوبلڈ۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔“

اس نے تیزی سے اطلاع دی تھی۔۔۔۔۔

”آپ مسز ہیں ان کی؟“

ڈاکٹر نے عجلت سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”ٹھیک ہیں چلیں۔۔۔۔۔ اس وارڈ کی طرف۔۔۔۔۔“

ایک وارڈ بوائے کے حوالے اسے کرتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر دوبارہ آپریشن ٹھیٹر کی

طرح بڑھ گیا تھا

اندرونی چوٹوں کی وجہ سے اس کا سی ٹی سکین بھی کیا جا رہا تھا۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد خون کا انتظامات کر لیا گیا تھا

لیکن کمزوری کی وجہ سے زرباش کمرے میں ہی تھی۔۔۔۔۔

حالانکہ وہ رکنے پہ تیار نہیں تھی لیکن ڈاکٹر کے ہدایات کے مطابق اسے تھوڑی دیر آرام کرنا

پڑا۔۔۔۔۔

رضیہ دوپٹہ سر پہ اوڑھے مسلسل دعاؤں میں مصروف تھی۔۔۔۔۔

بظاہر وہ اتنی اونچائی سے نہیں گرا تھا لیکن سر کے بل گرنے کی وجہ سے اس کے سر کے

بہت نازک حصے پہ لگی تھی رہی سہی کسر خون نے پوری کر دی تھی۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد۔۔۔۔۔ ڈاکٹر باہر نکلا تھا سب نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا

تھا۔۔۔۔۔

”اب خطرے سے باہر ہیں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد مل سکتے ہیں آپ ان سے۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر نے جیسے ایک نئی زندگی کا صور پھونکا تھا
سب کے تئیں ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔۔۔۔۔
ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی۔۔۔۔۔ زرباش نے۔۔۔۔۔ تشکر بھری نظروں سے
آسمان کی طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔
اب سب پہلے سے مطمئن نظر آتے تھے۔۔۔۔۔
رضیہ کی نظر زرباش پہ پڑی تو انہوں نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگا لیا۔۔۔۔۔
مہر النساء نے۔۔۔۔۔ بے چینی سے پہلو بدلا۔۔۔۔۔
رجب خان۔۔۔۔۔ میرداد کی طرف مڑے۔۔۔۔۔ تو وہ رخ موڑ گئے
ان کے اس عمل نے انہیں تکلیف دی تھی۔۔۔۔۔
زرباش۔۔۔۔۔ اور رضیہ۔۔۔۔۔ شکرانے کے نوافل ادا کرنے۔۔۔۔۔ ہسپتال کے مسجد
کی طرف چلی گئی

اسی لمحے میرداد تیزی سے ہسپتال سے باہر نکل گئے تھے۔۔۔۔۔
رجب خان نے تاسف سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔۔۔



دعاؤں ہو گئی نارد تمہاری
میں قائل ہی نہ تھا فلسفوں کے۔۔۔۔۔
شام کے گہرے سائے جب ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔۔۔۔۔ اسی لمحے انہوں
نے کسی کی عارضی خوشیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔۔۔۔۔
اس نے۔۔۔۔۔ جنونی انداز میں۔۔۔۔۔ سائیڈ ٹیبل پہ
پڑا۔۔۔۔۔ گلدان۔۔۔۔۔ ٹی وی پہ دے مارا تھا۔۔۔۔۔
خبریں پڑتی نیوز کاسٹرو ہی مجمند ہوئی تھی۔۔۔۔۔
”وہ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔“

وہ زمین پہ بیٹھ کے اپنے بال نوچتے ہوئے ہذیاتی کیفیت میں چلائی ی۔۔۔۔۔
”میں اس کا قتل کروں گی۔۔۔۔۔ محبت کے نام پہ بے وقوف بنایا ہے اس نے
مجھے۔۔۔۔۔“

وہ دھمکی دینے والے انداز میں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ پھر چلائی ی لیکن۔۔۔۔۔ یہاں سننے والا
کوئی ی نہیں تھا۔۔۔۔۔

اس کا موبائی ل ذور ذور سے بج رہا تھا اور یہ آوازیں کسی ہتھوڑے کی طرح اس کی سماعتوں پہ
برس رہی تھی

اس نے مضبوطی سے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ کے ان آوازوں کا گلا گھوٹنے کی شعوری کوشش
کی۔۔۔۔۔

ایک جھٹکے میں صدیقی نے اس کا پورا کرئی یرتباہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جس وقت سے یہ
اسیکنڈل اوپن ہوا تھا۔۔۔۔۔ جس میں۔۔۔۔۔ مووی کی شوٹیں کے دوران کی کچھ نازیا

تصاویر اور۔۔۔۔۔ وہ محبت بھرے مسیجز جو اس نے۔۔۔۔۔ صدیقی کو کیے تھے۔۔۔۔۔ منظر
عام پہ آئے تھے اس کی بنی بنائی عزت ملیا میٹ ہو گئی تھی وہ رانی جس کو کل تک پلکوں پہ
بٹھایا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ آج اسے زمین پہ پٹھ دیا گیا تھا۔۔۔۔۔
صدیقی نے آج صبح ہی ایک پریس کانفرنس میں اس پہ الزام لگایا تھا۔۔۔۔۔ کہ ایسی اداکار جو
سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے کسی بھی پروڈیوسر کو بدنام کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ محبت کا جال
پھینک سکتی ہیں۔۔۔۔۔ اسکرپٹس چوری کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ کچھ بھی کر سکتی
ہے۔۔۔۔۔ وہ کسی طور بھی ان کی فلم کے لیے موضوع نہیں
اس نے یہ سب صدیقی کی محبت میں خوشی خوشی کیا تھا۔۔۔۔۔
اس نے واقعی ہی بہت سے دوسرے پروڈیوسرز کے ساتھ دوستیاں کی تھیں ان کا کام چرایا تھا
اور آج صبح یہ سب صدیقی نے اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔۔۔۔۔

اس میں واضح لفظوں میں اس پہ یہ بھی الزام تھا کہ کام حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ کو زہر دینے کی بھی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔

اور باقاعدہ اس اداکارہ نے انٹرویو دیتے ہوئے اس بات پہ مہر بھی ثبت کی تھی۔۔۔۔۔

اس کے بعد سے سب ڈائریکٹرز پروڈیوسرز نے۔۔۔۔۔ اس سے دست بردار ہونے

کا۔۔۔۔۔ فیصلہ سنا دیا تھا سب کو اپنا کام چوری ہونے کا خطرہ تھا۔۔۔۔۔

ایک سینڈ میں اسے آسمان سے زمین پہ پٹھا گیا تھا

صدیقی نے اپنی فلم بھی واپس لے لی تھی۔۔۔۔۔

موبائل ایک دفعہ پھر بج اٹھا تھا

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے موبائل کو دیکھا۔۔۔۔۔

کانپتے ہاتھوں سے موبائل ہاتھ میں لیا۔۔۔۔۔

اس کے چہرے پہ اذیت کے رنگ ابھرے تھے۔۔۔۔۔

اس نے تیزی سے کال پک کر کے کانوں کے ساتھ فون لگایا تھا ہاتھ ابھی بھی کانپ رہے
تھے۔۔۔۔۔

”کس چیز کا بدلہ لیا ہے آپ نے مجھ سے۔۔۔۔۔؟“

اس نے۔۔۔۔۔ نچلا لب کاٹتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں۔۔۔۔۔ ہارے ہوئے لہجے
میں پوچھا تھا۔۔۔۔۔

دور۔۔۔۔۔ اس فلیٹ میں بیٹھے۔۔۔۔۔ اس شخص کو۔۔۔۔۔ عجیب سی ندامت ہوئی تھی
جو بھی تھا وہ ایک برا شخص نہیں تھا

لیکن جو کچھ بھی اس نے۔۔۔۔۔ ایک بے گناہ لڑکی کے ساتھ کیا تھا وہ بھی کسی طور قابل قبول
نہیں تھا۔۔۔۔۔

”میں نے یہ سب وہاں کے کہنے پہ کیا تھا۔۔۔۔۔ میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی
نہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے۔۔۔۔۔ کہنی میز پہ ٹکاتے ہوئے اسے جیسے صفائی دی تھی۔۔۔۔۔

”تو وہ محبت وہ سب جھوٹ تھا ڈرامہ تھا۔۔۔۔۔؟“

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جیسے ڈرتے ہوئے پوچھا تھا۔۔۔۔۔

”رانی بی بی محبت پیار۔۔۔۔۔ ایک ڈرامہ ہی تو ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تم خود بتاؤ مرد کی محبت ڈرامے

کے سوا کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ ایک جال سے بڑھ کے اور کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ جال پھینکنے کا

عادی۔۔۔۔۔ شکاری ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ”یہ تو عورت ہے۔۔۔۔۔ جو ہنسی خوشی اس کے جال میں

پھنس جاتی ہے اور پھر یہ سوچتی ہے۔۔۔۔۔ کہ اب یہ صرف میرا ہے لیکن وہ یہ کیوں بھول

جاتی ہے کہ۔۔۔۔۔ شکاری شکار کرنے سے باز نہیں آتا۔۔۔۔۔“

انہوں نے جیب سے سگریٹ نکالی تھی۔۔۔۔۔ ساتھ ہی کافی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے

اسے سمجھایا تھا

”وہاں نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

اس نے سامنے کے بالوں کو مٹھی میں جھکڑتے ہوئے سرد آہ بھری تھی
”یہ بات تو ان کے منہ کے ساتھ اچھی لگتی ہے جنھوں نے خود کسی کے ساتھ برا نہیں کیا
ہوتا۔۔۔۔۔“

انہوں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس غصہ آہنی کے ساتھ اسے باور کروایا تھا۔۔۔۔۔
وہ خاموش رہی تھی
اب بولنے کے لیے کیا بچا تھا۔۔۔۔۔

”محترمہ یہاں تو ہم سب۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے گناہ گار ہیں۔۔۔۔۔ کسی کہانی کے ہیرو
تو کسی کہانی کے ولن ہوتے ہیں ٹھیک اسی کردار کی طرح۔۔۔۔۔ جو ایک کہانی میں معافی مانگتا
ہے تو دوسری میں معاف کرتا ہے۔۔۔۔۔“

سگریٹ کا دھواں ان کے چہرے کا طواف کر رہا تھا وہ ہاج جیسی باتیں کرنے لگے
تھے۔۔۔۔۔

”وہ کہا کرتا ہے جیسے آنکھ کا بدلا آنکھ اور کان کا بدلہ کان ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ویسی ہی

عزت کا بدلہ عزت ہوتا ہے۔۔۔۔۔

میں پہلے اس بات سے متفق نہیں تھا لیکن اب میں متفق ہوں۔۔۔۔

وہ دوبارہ صوفی بیٹھ گئے تھے۔۔۔۔۔

دوسری طرف وہ لب کھلتے انہیں سن رہی تھی۔۔۔۔۔

لوگ کہتے ہیں بے وفائی کرنے والوں کو معافی نہیں ملنی چاہیئے لیکن میں کہتا

ہوں۔۔۔۔۔ بے عزتی کرنے والوں کو۔۔۔۔۔ معافی نہیں ملنی چاہی مئے۔۔۔۔۔ بے

وفائی۔۔۔۔ کرنے والے آپ کا یقین اٹھا دیتے ہوں گے محبت سے۔۔۔۔ تذلیل کرنے

والے آپ کا اپنے اوپر سے بھی یقین اٹھوا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کو اپنی نظروں میں مجرم بنا

کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔

تذلیل اور بے عزتی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔۔۔۔۔

انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔۔۔۔۔ سگریٹ دونوں انگلیوں کے درمیان دبائے وہ اب

۔۔۔۔۔ کافی پر سکون دیکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”میں اب کبھی نہیں اٹھ پاؤں گی صدیقی صاحب۔۔۔۔۔“ آپ نے مجھے بہت گہری چوٹ

دی ہے۔۔۔۔۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے لہجے میں طنز برقرار نہ رکھ پائی اور بے بسی در آئی۔۔۔۔۔

جواب میں وہ ذور سے ہنسنے لگی۔۔۔۔۔

”ایسے مت کہیں رانی بی بی۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔ کے ساتھ کوئی برا نہیں کرتا وہ خود ہی کافی

برا کرنے کی سکت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ انسان خود اپنا مجرم ہوتا ہے بعض اوقات اسے خواب

اس قدر اندھا کر دیتے ہیں کہ اسے اپنا آپ بھی دیکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔۔“

ان کے لہجے میں تاسف تھا۔۔۔۔۔

”پتہ نہیں ہم اپنے خواب پورے کرنے کے لیے خود پر یقین کرنے کے بجائے سیڑھیاں کیوں تلاش کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

خیر انہوں نے سر جھٹک دیا۔۔۔۔۔

”ایک بات یاد رکھی گئے گا کہ میرے یا وہاں کے کچھ بھی غلط کرنے سے پہلے۔۔۔۔۔ آپ نے خود اپنے ساتھ برا کیا تھا۔۔۔۔۔ آپ کو پہلے تو محض بدلہ لینے کے لیے کسی بے گناہ کی عزت کو نیلام نہیں کرنا چاہیئے تھا اگر کر ہی دیا تھا تو۔۔۔۔۔ دشمن سے یوں بے خبر رہنا حماقت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ دشمن چھوٹا بڑا۔۔۔۔۔ نہیں ہوتا دشمن۔۔۔۔۔ دشمن ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یہ نہیں کہ آپ کو کچھ دیکھائی می نہیں دے رہا تھا آپ کا شمار عورتوں کی اس قسم میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جن کی آنکھوں پہ خوابوں کا اس قدر بوجھ ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ دیکھائی می نہیں دے رہا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے سفاکی سے اسے آئی نہ دیکھا یا۔۔۔۔۔

”قسمت کو بدلنے کا ایک ہی راستہ ہے جو بالکل سیدھا کافی لمبا۔۔۔۔۔ اور خاردار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ باقی۔۔۔۔۔ جو شارٹ کٹس ڈھونڈتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بہت کم وقت کے لیے ابھرتے ہیں اور پھر معدوم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔“

انہوں نے تیزی سے کہہ کے کال کاٹ دی تھی

اس سے زیادہ وہ حوصلہ نہیں رکھتے تھے

گھبرا کے انہوں نے۔۔۔۔۔ پانی کے ایک دو گلاس انڈھیلے تھے لمبے لمبے سانس لے کے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔

”انسان کی ایک بری عادت شاید یہی ہے کہ اسے ناچاہتے ہوئے بھی اپنے جیسے انسانوں سے انسیت ہو جاتی ہے جسے وہ بعض اوقات محبت کا نام دے دیتا ہے۔۔۔۔۔“

لیکن وہ عمر کے اس حصے میں تھے کہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ محبت اور انسیت کے درمیان فرق کر سکتے تھے

وہ یوں بھی مرد تھے محبت کا فلسفہ انہیں کم ہی سمجھ آتا تھا۔۔۔۔۔

لیکن دوسری طرف موجود لڑکی۔۔۔۔۔ بد قسمتی سے عورت تھی اسے محبت چاہت اور

انسیت میں فرق کرنا نہیں آتا تھا۔۔۔ وہ اکثر انسیت کو محبت کا نام دے کے۔۔۔۔ اپنی

زندگی کے قیمتی سال برباد کر دینے والی لڑکی تھی۔۔۔۔۔ اور کبھی چاہت کو محبت کا نام دے

کے پوری رات جاگ کے گزار دیتی تھی۔۔۔۔۔ وہ لڑکی تھی۔۔۔۔۔ بہت عام سی

لڑکی۔۔۔۔۔ اس کے اطوار خاص لڑکیوں سے مختلف تھے۔۔۔۔۔

یہ دو اس کہانی کے۔۔۔۔ وہ کردار تھے جنہیں مرد اور عورت کہا جاتا ہے۔۔۔۔

اور یہ دونوں ہی محبت کے فلسفے سے بے بہرہ محبت کا دم بھرنے والے کردار۔۔۔۔۔

اس نے بجھے دل کے ساتھ موبائی ل کو دیکھا اور پھر وہ نمبر ہمیشہ کے لیے ڈلیٹ کر دیا

قفا

عورت تھی کہیں نہ کہیں سے بہادر تو تھی۔۔۔۔

اس نے فون کو سائیڈ پر رکھا تھا۔۔۔۔

پھر دھاڑیں مار مار کے روئی ی تھی۔۔۔۔۔

وہ عورت تھی کمزور بھی تو انتہا ۶ درجے کی تھی۔۔۔۔

”عورت کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

بڑی پیاری تخلیق۔۔۔۔۔؟“

بہادری اور کمزوری کا ملاپ۔۔۔۔۔“

کوئی ی ہنس کر جیسے طنز کر رہا تھا۔۔۔۔۔

اس کہانی کے۔۔۔۔۔ چار کرداروں میں سے۔۔۔۔۔ وہ ایک بھی کردار نہیں تھی۔۔۔۔

”وہ زرپاش نہیں تھی وہ جہاں آرا ۶ بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ ماہ جبین بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔“

وہ رانی تھی۔۔۔۔۔ ایک کوٹھے کی طوائف۔۔۔۔۔“

اور طوائف تو پھر طوائف ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔

نام بدلنے سے۔۔۔۔۔ کہانیاں نہیں بدلا کرتی۔۔۔۔۔

کچھ لوگ ہماری زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو نئے خواب دیکھانے کے چکر میں ہمارے

گزشتہ خواب بھی چھین کے ہماری آنکھیں ویران کر دیتے ہیں

اس نے تھک کے سر بیڈ پیچھے صوفے کے ساتھ ٹکا لیا تھا۔۔۔۔۔

حسن اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔۔۔۔۔“

اور اس سے بڑی حقیقت۔۔۔۔۔؟“

”پیسہ۔۔۔۔۔“

جو حسن کو بھی خرید لیتا ہے۔۔۔۔۔

اور اس سے بڑی۔۔۔۔۔؟“

پاور۔۔۔۔۔”طاقت۔۔۔۔۔

جو حسن اور پیسے دونوں کو مات دے دیتی ہے۔۔۔۔۔



اب نہ وہ میں نہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنا کے سراپوں میں ملیں۔۔۔۔

جس وقت وہ اس وارڈ میں داخل ہوئی اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔۔۔۔۔ وہ
اپنے اندر۔۔۔۔۔ اتنا حوصلہ نہیں جمع کر سکتی تھی کہ وہ اس انسان کو یوں۔۔۔۔۔ سوئی یوں
اور پیوں میں جھکڑا دیکھے۔۔۔۔۔ جو ہمیشہ جم کے کھڑا رہنے پہ یقین رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ اسے
یقین تھا وہ اس انسان کی خاموشی سے اکتا جائے گی جو ہمیشہ مقابل کو چپ کروا دیتا تھا۔۔۔۔۔
”میرداد تو پہلے ہی چلے گئے تھے۔۔۔۔۔ شہباز خان اور مہر النساء نے بھی ان کی پیروی کی
تھی۔۔۔۔۔“

رجب خان تلملا کے رہ گئے تھے۔۔۔۔۔

رضیہ۔۔۔۔۔۔ اور رجب۔۔۔۔۔۔ وہاں سے ملنے گئے تھے۔۔۔۔۔۔ لیکن وہاں دوائی یوں
کے زیر اثر گہری نیند میں سو رہا تھا۔۔۔۔۔۔

اس لیے وہ دونوں اسے ٹوٹے دل کے ساتھ باہر سے دیکھ کے ہی لوٹ آئے تھے۔۔۔۔۔۔
زری اتنی دیر میں۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ بھی اسے دیکھنے نہیں گئی تھی
اب تورات کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔

زرباش کو رضیہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اس لیے اس نے ضد کر کے انہیں حویلی واپس
بجھو ادیا تھا

اب ہاسپٹل میں صرف۔۔۔۔۔۔ رجب اور۔۔۔۔۔۔ زرباش ہی تھے۔۔۔۔۔۔
آخر ہمت مجتمع کر کے اس نے اس کا سامنا کرنے کی ٹھانی تھی
وہ ابھی تک۔۔۔۔۔۔ دنیا جہاں سے بے خبر سو رہا تھا۔۔۔۔۔۔

اس نے اسٹول اس کے بیڈ کے قریب رکھا اور بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔۔۔۔

اس کی رنگت زرد تھی آنکھوں کے نیچے حلقے واضح تھے۔۔۔۔۔ ماتھے پہ پٹی بندھی ہوئی تھی

اس نے کچھ جھجھکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔۔۔۔۔

یہ وہ ہاتھ تھا۔۔۔۔۔ جو ہمیشہ اسے۔۔۔۔۔ تھام لیتا تھا۔۔۔۔۔

مشرقی عورت یوں بھی شوہر کی ہر چیز کو عقیدت کی ہی نگاہ سے دیکھتی ہے

سامنے موجود شخص۔۔۔۔۔ اس کا شوہر بھی تھا اور اس کا محبوب بھی۔۔۔۔۔

اس نے اس کا ہاتھ لبوں کے ساتھ لگایا پھر چہرے کے ساتھ وہ اسے محسوس کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔

پھر خاموشی سے سر اس کے سینے پہ ٹکا دیا تھا

اس کی دھڑکن اسے واضح سنائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔

یہ اس کی دھڑکن اس کے لیے جینے کی امید تھی۔۔۔۔۔

کب رات کے اندھیرے کی جگہ صبح کی روشنی نے لی تھی اسے محسوس ہی نہیں ہوا

تھا۔۔۔۔۔



وہ وحشت ہے کہ ہے وہ سوگ برپا۔۔۔

میں ہنستا تک نہیں ہوں قہقہوں سے۔۔۔

وہاں نے دھیرے سے آنکھیں کھولی تو منظر کچھ دھندلایا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس نے بامشکل

پوری آنکھیں کھول کے دیکھا۔۔۔۔۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔۔۔ اور تکلیف بھی ہو

رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے ذرا چہرہ نیچے کیا تو حیران ہوا۔۔۔۔۔

اس کے سینے پہ زرپاش سرٹکائے بے خبر سو رہی تھی

سابقہ مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے باری باری اسے سب یاد آنے لگا

تھا۔۔۔۔۔

اس نے کچھ پر سکون سی نظروں سے زرباش کو دیکھا تھا لیکن حرکت نہیں کی تھی اس ڈر سے کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔۔۔۔۔

وہ کافی دیر اس کے برائون بالوں کے جوڑے کو غائب دماغی دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی ی پھر تھوڑا سا اٹھا کے دیکھا نیم وا آنکھیں لال تھی۔۔۔۔۔

وہ یکدم شرمندہ سی ہو گئی۔۔۔۔۔
اس نے گڑبڑا کے فوراً سر اٹھا لیا۔۔۔۔۔
”سوئی رہتی نا۔۔۔۔۔“

وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں سے طنز تلاش نہ کر پائی۔۔۔۔۔
یہ آواز اس نے کئی گھنٹوں بعد سنی تھی۔۔۔۔۔

اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اس آواز کے لیے ترسی ہوئی ی تھی۔۔۔۔۔

”یہ کیا۔۔۔۔ کیا تھا آپ نے وہاں۔۔۔۔“

اس نے شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شکوہ تھا۔۔۔۔

”کیا کیا میں نے۔۔۔۔“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے انجان بنا تھا۔۔۔۔

”کچھ نہیں کیا تب ہی ادھر ہسپتال کے بیڈ پہ پڑے ہیں۔۔۔۔“

وہ چڑ کے بولی

تو وہ مسکرا دیا تھا۔۔۔۔

”میں تو تمہارے جانے کے خوف سے۔۔۔۔ یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔۔۔۔“

اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔۔

”مجھے ڈرا ہی دیا تھا آپ نے۔۔۔۔“

اس نے دانستہ نظریں چرا کے موضوع بدلا۔۔۔۔

”اور میری تو جان نکال دی تھی تم نے۔۔۔۔۔“

اس نے دلچسپی سے کہا

نظریں ابھی تک زرباش کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔۔۔

زرباش نظر چرا کے اٹھ کھڑی ہوئی

میں۔۔۔۔۔ بابا کو بتا کے آتی ہوں کہ آپ جاگ گئے ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے نظر بچا کے وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی

اس نے۔۔۔۔۔ چونک کے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

چچا جان کو معاف کر دیا ہے تم نے۔۔۔۔۔؟“

اس نے سر سری پوچھا تھا

”نہیں آپ کے بابا جان نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے ہنس کے جواب دیا تھا

جس سے اسے خوشگوار حیرت ہوئی ی تھی۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد رجب اندر آئے تھے انہوں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔۔۔۔۔ اب اس سے

خوشگوار لہجے میں باتیں بھی کر رہے تھے

تھوڑی دیر بعد رضیہ بھی آگئی تھی

لیکن۔۔۔۔۔ وہاں کی نظریں کسی اور کو تلاش کر رہی تھی۔۔۔۔۔

”دادا جان نہیں آئے۔۔۔۔۔؟“

بظاہر عام سے لہجے میں پوچھے گئے سوال میں۔۔۔۔۔ آس تھی۔۔۔۔۔

”وہ نہیں آئے“

رجب نے۔۔۔۔۔ نظر چرا کے اطلاع دی تھی۔۔۔۔۔

رضیہ کا چہرہ بھی بج گیا تھا۔۔۔۔۔

”ان سے کہنا اب آنے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ وہاں اب گرنے کے بعد خود ہی اٹھنا
سیکھ گیا ہے۔۔۔۔۔۔“

اس نے چھت کو گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔۔۔
لیکن اس کے لہجے کی سختی زرباش سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔۔۔۔۔۔



تمہارے میرے بیچ ایک دیوار ہے
جسے اونچا کریں گے نفرتوں سے۔۔۔۔۔۔
وہاں کو۔۔۔۔۔۔ تین دن کے پاس ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ اب وہ حویلی واپس آ گیا تھا
اور پہلے سے قدرے بہتر تھا۔۔۔۔۔۔
لیکن حویلی میں ہنوز سرد مہری کی فضا قائم تھی۔۔۔۔۔۔
بڑے کمرے میں۔۔۔۔۔۔ رجب اور میرداد کی تکرار زور پکڑ چکی تھی۔۔۔۔۔۔

”باباجان۔۔۔۔۔ بیٹا ہے میرا وہ۔۔۔۔۔ آپ کا پوتا ہے مجھ سے زیادہ آپ نے محبت کی ہے اس کے ساتھ۔۔۔۔۔“ آپ کیسے اتنے پتھر دل ہو سکتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ اس کو ایک نظر دیکھنے بھی نہ جائی یں۔۔۔۔۔“

وہ تاسف سے۔۔۔۔۔ انہیں کہہ رہے تھے جو ان کی طرف پیٹھ کیے باہر باغیچے میں پتہ نہیں کیا تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔۔

”ہم سے فضول بحث کا کوئی ی فائی دہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اسے کہہ دو جا کے ہم تب تک اس سے نہیں ملیں گے جب تک وہ اس لڑکی کو طلاق نہیں دے گا۔۔۔۔۔“

انہوں نے سر دمہری سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”باباجان وہ کبھی طلاق نہیں دے گا اسے۔۔۔۔۔“

انہوں نے میرداد کو جیسے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔

”ہم بھی نہیں ملے گے پھر ان سے۔۔۔۔۔“

انہوں نے پلٹ کے رجب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکیت کی حد کر دی تھی۔۔۔۔۔
مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہی۔۔۔۔۔ بھابھی اور رجب بھائی نے اس لڑکی کو اتنی آسانی سے قبول
کیسے کر لیا۔۔۔۔۔“

ساتھ والے کمرے میں مہرالنسا نے کپڑے تہہ کرتے ہوئے کھوجتی ہوئی نگاہوں
سے۔۔۔۔۔ اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا تھا۔۔۔۔۔

جو ایسے بیٹھے تھے جیسے انہوں نے۔۔۔۔۔ سنا ہی نہ ہو۔۔۔۔۔
”ہم یہاں نہیں رہیں گے زرباش۔۔۔۔۔“

اور اوپر اس کشادہ کمرے میں اس نے زری کے ہاتھ سے سوپ پیتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔
”وہ بری لڑکی نہیں ہے بابا۔۔۔۔۔“ ”خون ہے آپ کا۔۔۔۔۔“

رجب خان نے صفائی دے کے جیسے انہیں قائل کرنا چاہا۔۔۔۔۔
”میری بیٹی ہے وہ۔۔۔۔۔“ ”مہرالنسا۔۔۔۔۔“

انہوں نے اسی طرح بیٹھے ہوئے اسے باور کروایا۔۔۔۔۔
”لیکن کیوں۔۔۔۔۔؟“

زرپاش نے چونک کے وہاں کا چہرہ دیکھا تھا۔۔۔۔۔
”نہیں ہے ہمارا خون وہ لڑکی۔۔۔۔۔ وہ اس رقصہ بد کردار عورت کی بیٹی ہے۔۔۔۔۔“
ان کے ہر لفظ سے رعونت ٹپک رہی تھی۔۔۔۔۔
”بہت جلدی نہیں یاد آگیا آپ کو۔۔۔۔۔ وہ خرافہ دکھتی ہوگی۔۔۔۔۔ آپ کو اس
میں۔۔۔۔۔“

وہ تنک کر بولی تھی۔۔۔۔۔

تو شہباز خان کا ہاتھ اٹھ گیا تھا ان پہ۔۔۔۔۔
”کیوں کہ

یہاں کوئی تمہیں قبول نہیں کرے گا۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا تم ایسی جگہ رہو جہاں تمہاری عزت نہ ہو۔۔۔۔

اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے اعتماد میں لیا تھا۔۔۔۔
”بابا کچھ تو خدا کا خوف کریں۔۔۔۔ کیوں کسی مری ہوئی عورت کے متعلق ایسی بات بولتے ہیں۔۔۔۔“

رجب خان نے خود کو کچھ غلط کہنے سے روکا۔۔۔۔
”ایک لفظ بھی مت بولنا تم اور۔۔۔۔ یہی طمانچہ۔۔۔۔ میں تمہارے منہ پہ تب مار دیتا تو آج میں اپنی بیٹی کے سامنے یوں شرمندہ نہ ہو رہا ہوتا۔۔۔۔“
ان کے لہجے میں اجنبیت تھی سختی تھی
مہر النساءؑ گال پہ ہاتھ رکھے۔۔۔۔ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

نہیں۔۔۔۔۔ وہ کدھر ہو گئی۔۔۔۔۔ زندہ ہو گئی یا مر گئی ہو گئی۔۔۔۔۔ ”میرا دل کہتا ہے

انہوں نے میری ماں۔۔۔۔۔ سے کبھی محبت نہیں کی۔۔۔۔۔“

اس نے یونہی اپنے ہاتھوں میں کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

”اور جسے تم خرافہ کہہ رہی ہو نا وہ محبت ہے میری۔۔۔۔۔ پچیس سالوں اس کی محبت کسی

ناسور کی طرح میرے دل میں ہے۔۔۔۔۔ اور دیمک کی طرح اندر ہی اندر مجھے چاٹ چکی

ہے۔۔۔۔۔“

وہ بات کرتے کرتے ہانپنے لگے تھے۔۔۔۔۔

مہر النساء خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ کے رہ گئی تھی۔۔۔۔۔

اتنے سال واقعی ہی اکارت گئے تھے۔۔۔۔۔

وہ جس اعتراف سے اتنے سال پہلے ڈر گئی تھی اور انہوں نے ایک مظلوم بچی کے ساتھ ظلم

کر ڈالا تھا۔۔۔۔۔

وہ اعتراف آج ہو چکا تھا۔۔۔۔

”تم ٹینشن مت لو۔۔۔۔۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ تم پرانی باتیں بھول جاؤ

اس نے اسے دکھی ہوتے دیکھ کے۔۔۔۔۔ اس کو بہلانے کی شعوری کوشش کی

وہ زبردستی مسکرائی تھی

رجب خان نے ایک لامنتی نگاہ۔۔۔۔۔ میرا دپہ ڈالی اور باہر نکل گئے۔۔۔۔۔

اور شہباز خان وہی صوفے پہ ڈھ گئے تھے۔۔۔۔۔



تمہارے غم سے بیزار ہیں کیا ہم

نہیں مگر شاید ہاں کچھ دنوں سے۔۔۔

”میں اور زری۔۔۔۔۔ کینیڈا شفٹ ہونے والے ہیں۔۔۔۔۔“

اس نے رات کھانے کی میز پہ۔۔۔۔۔ سب کو آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔

سب نے ایک ساتھ سر اٹھا کے دیکھا تھا۔۔۔۔۔

یہاں سب موجود تھے سوائے میر داد کے۔۔۔۔۔

”یہاں کیا مسئی لہ ہے تمہیں۔۔۔۔۔؟“

رجب خان نے پلیٹ سائیڈ پہ کر کے دونوں کہنیاں میز پہ ٹکائی پھر سنجیدگی سے پوچھا

تھا۔۔۔۔۔

”عزت کا۔۔۔۔۔“

اس نے پلیٹ میں چٹچ ہلاتے ہوئے لا پرواہی سے کہا تھا۔۔۔۔۔

”باباجان اس وقت غصے میں ہیں معاف کر دیں گیں تمہیں۔۔۔۔۔“

رضیہ نے بے چینی سے پہلو بدل کے۔۔۔۔۔ اسے سمجھانا چاہا۔۔۔۔۔

وہ یہی سمجھی۔۔۔۔۔ کہ شاید میر داد کے رویے کی وجہ سے۔۔۔۔۔

”مجھے ان کے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔“

اس نے ایک ایک لفظ چبا کے ادا کیا تھا

زری نے زرا گردن گھما کے اس طرف دیکھا تھا جدھر شہباز خان بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔

ان کی نظروں میں آس تھی۔۔۔

زری پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔۔۔۔۔

”ان کا نہ سہی ہمارا تو سوچو۔۔۔۔۔ اب تو زری کو بھی قبول کر لیا ہے۔۔۔۔۔“ ”ہم

نے۔۔۔۔۔“

انہوں نے۔۔۔۔۔ قدرے بے بسی سے وہاں کو روکنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ یہاں میں اور زری دونوں ہی ڈسٹرب

رہینگے۔۔۔۔۔“

اس نے اطمینان سے۔۔۔۔۔ چاولوں سے بھری چچی منہ میں ڈالتے ہوئے ایک نظر شہباز خان

کو دیکھ کے کہا تھا۔۔۔۔۔

”زری معاف نہیں کر سکتی انہیں۔۔۔۔۔۔“

اس نے بڑے آرام سے کہا تھا۔۔۔۔۔۔

”مہر النساء نے ایک دفعہ بھی سراٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔

شہباز خان بھی خاموش رہے تھے۔۔۔۔۔۔

”میں اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔“

اس نے سراٹھا کے براہ راست۔۔۔۔۔۔ شہباز خان کی طرف دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔

ان کی آنکھوں میں کرب ابھرا تھا۔۔۔۔۔۔

”وہ مر چکی ہے۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے سر جھکا کے اسے آگاہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔

وہ کتنی ہی دیر ان کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔۔

پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی

سپاٹ نظروں سے ایک نظر وہاج کو دیکھا۔۔۔۔۔
اس کے بعد کچھ بھی پوچھنا ضروری نہیں تھا۔۔۔۔۔
اس سارے واقعے میں وہاج کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی
لیکن زری کو تھی کہ اس کی ماں کون تھی کیسی تھی۔۔۔۔۔؟
وہاج نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔۔۔۔۔
اپنے فیصلے سے وہ پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا اس لیے سب نے چپ سادھ لی تھی
سوائے کمرے کے باہر کھڑے میر داد کے۔۔۔۔۔
انہوں نے ایک نفرت بھری نگاہ۔۔۔۔۔ دور جاتی زر پاش پہ ڈالی اور دوبارہ کمرے کے اندر
چلے گئے۔۔۔۔۔



تو خدا ہے نامیرا عشق فرشتوں جیسا

دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں۔۔۔۔۔

انہیں یہاں۔۔۔۔۔ آئے دو سال مکمل ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ دو سال پہلے وہ آخری دفعہ شہباز خان سے تب ملی تھی جب اس نے ان سے اپنی ماں کے متعلق پوچھا تھا۔۔۔۔۔ وہ یہاں آنے سے پہلے مری گئی تھی۔۔۔۔۔ وہاں وہ سفینہ سے ملی تھی اپنی ماں کی تصویر دیکھی تھی سفینہ کی زبانی ہی ساری کہانی سنی تھی۔۔۔۔۔ اس کے دل میں شہباز خان کے لیے رہی سہی عزت بھی اسی دن ختم ہو گئی تھی اس سے زیادہ برا تو اس کی ماں کے ساتھ ہوا تھا۔۔۔۔۔ صرف اس بنا پر کہ وہ خوبصورت نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ دونوں حویلی نہیں لوٹے تھے۔۔۔۔۔ رضیہ اور رجب سے ان دونوں کی بات۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ویڈیو کال پہ ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ ان کی ہی زبانی وہاں نے سنا تھا کہ میرا دادا سے بہت یاد کرتے ہیں اس سے ملنا چاہتے ہیں لیکن وہاں کا دل ان کی طرف سے برا ہو چکا تھا جس لمحے اسے ان کی ضرورت تھی اس لمحے وہ اس کے ساتھ نہیں تھے۔۔۔۔۔ اور وہ آج بھی زرخاش کو قبول نہیں کرتے

تھے۔۔۔۔۔ شہباز خان نے اپنی زندگی کے دو اور سال محض۔۔۔۔۔ پچھتاوے کے نام
کردیئے تھے۔۔۔۔۔ اور وہاج کے نزدیک گناہ گار کی سب سے بڑی سزا اس کا پچھتاوا
ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اللہ کے الف اور انسان کے الف کا دوسرا فرق۔۔۔۔۔ ”اللہ معاف
کرتا ہے۔۔۔۔۔ انسان معاف نہیں کرتا۔۔۔۔۔ یہ تو خدا کا ہی حوصلہ ہے۔۔۔۔۔ بندہ
اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“
وہ جس وقت کمرے کے اندر آئی تھی۔۔۔۔۔ اس وقت وہ منہ تک لحاف اوڑے آنکھیں
موندے لیٹا تھا زرباش کو گمان ہوا کہ شاید وہ سو گیا ہے وہ دونوں یہاں ایک اپارٹمنٹ میں رہ
رہے تھے۔۔۔۔۔

جو جدید طرز کا بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔

وہ ابھی ابھی کچن کا پھیلا واسمیٹ کے آئی تھی۔۔۔ ارادہ دیر تک وہاں سے باتیں کرنے کا تھا لیکن اسے یوں سو یاد کیجھ کے وہ مایوس ہوئی تھی۔۔۔

وہ سائیڈ لمپ بند کرنے ہی لگی تھی جب وہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔۔

وہ مسکرا کے پلٹی تھی

یہ اس کی پرانی عادت تھی۔۔۔۔۔ جو وہ اکثر اسے چڑانے کے لیے استعمال کرتا تھا

”سوئے نہیں آپ۔۔۔۔۔؟“

اس نے اس کے مسکراہٹ ضبط کر کے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے۔۔۔۔۔ کہا۔۔۔۔

”آپ کے بغیر نیند کہاں آتی ہے ہمیں۔۔۔۔۔؟“

اس نے محبت سے چور لہجے میں کہا تھا۔۔۔۔

”پھر مان کیوں نہیں لیتے محبت ہے آپ کو ہم سے۔۔۔۔۔“

وہ آج موڈ میں تھی

لہازہ۔۔۔۔۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں سموئے۔۔۔۔۔ آنکھیں مٹکا کے

کہا۔۔۔۔

”یہ اعتراف تو میں مر کے بھی نہ کروں۔۔۔۔۔“

اس نے اسے ہری جھنڈی دیکھائی تھی۔۔۔۔۔

اس نے جواب میں براسا منہ بنایا تھا۔۔۔۔۔

”خیر یہ اعتراف آپ نے دو سال پہلے کر دیا تھا۔۔۔۔۔“

اس نے ایک اداسے۔۔۔۔۔ سامنے کے بالوں کو جھٹکے ہوئے اسے یاد دلایا تھا۔۔۔۔۔

”کب۔۔۔۔۔؟“

وہ یکسر انجان بنا۔۔۔۔۔

”یہ آپ کی یادداشت جانے سے پہلے کا قصہ ہے۔۔۔۔۔“

اب کی بار اس نے تیوری چڑائے جل کے کہا تھا۔۔۔۔۔

”اور میری یادداشت کب گئی تھی۔۔۔۔۔؟“

اس نے ایک ابرو اٹھا کے استفسار کیا تھا

سیڑھیوں سے گرنے کے بعد۔۔۔۔۔؟

اور ساتھ ہی۔۔۔۔۔ لیٹ کے منہ پر کمبل اوڑ لیا تھا

یہ ناراضگی کا سگنل تھا۔۔۔۔۔

لیکن دوسری طرف بھی وہاج تھا مجال ہے اسے ایک دن بھی منایا ہو

زری بھی اثر نہ لیتے ہوئے نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔۔۔۔۔

وہ ہمیشہ کی طرح دھیرے سے اٹھا تھا۔۔۔۔۔

پھر سائیڈ کے دراز سے بلیک کور والی ڈائی ری نکالی یہ اس کا معمول تھا وہ روز۔۔۔۔۔ زریپاش

کے سونے کے بعد اپنے سب راز دل کی باتیں ڈائی ری میں لکھتا تھا

جس بات سے زری بے خبر تھی۔۔۔۔۔

اس نے پن اٹھایا اور قلم اب تیزی سے سفید صفحے پر حروف بکھیر رہا تھا

”تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا۔۔۔۔۔۔ کہ وہاں۔۔۔۔۔۔ گناہ گار تو ہم سب ہی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن سارے پیمانے۔۔۔۔۔۔ ایک طوائف کے کردار کو ہی کیوں تولتے ہیں۔۔۔۔۔۔ تمہارا سوال ٹھیک تھا لیکن اس وقت میرے پاس جواب نہیں تھا۔۔۔۔۔۔“ لیکن آج میرے پاس جواب ہے۔۔۔۔۔۔ ”ہم سب اداکار ہیں۔۔۔۔۔۔ اور فنکار بھی اور گناہ گار بھی۔۔۔۔۔۔ سب رقص کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ لیکن بدنام صرف رقصہ ہوتی ہیں کیوں۔۔۔۔۔۔ ”؟“ رقص لفظ چاہے تمہیں مجھے یا کسی اور کو سننے میں معیوب لگے لیکن ہے تو حقیقت۔۔۔۔۔۔ انسان کی محبت۔۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔۔۔۔ کسی پر سرور موسیقی کی طرح بجتی ہے۔۔۔۔۔۔ تو انسان کے پاؤں خود با خود اٹھنے لگتے ہیں جب اس کا نشہ رگ رگ میں سرایت کرتا ہے تو۔۔۔۔۔۔ پورا جسم ہی تو محض رقص ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔“ آنکھیں اسی طرف اٹھتی ہیں جہاں محبوب ہو۔۔۔۔۔۔ محبوب کے گرد تمام عمر رقص کرتے ہی گزار دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور تمہیں تو

پتہ ہے مرد یہ رقص دیکھنے کا دیوانہ ہے اسے اپنے عشق میں اپنے گرد محور رقص عورت پر کشش لگتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ وہ۔۔۔۔۔ اس رقصہ کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے۔۔۔۔۔ محبت کا دعویٰ تب بھی نہیں کرتا۔۔۔۔۔ کیونکہ میں شہباز خان نہیں ہوں۔۔۔۔۔ میں وہاج ہوں۔۔۔۔۔ میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں۔۔۔۔۔ میں ایک بشر ہوں۔۔۔۔۔ جسے کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہوں میں اس میں قصور ار نہیں میں تخلیق ہی ایسے کیا گیا ہوں۔۔۔۔۔ ”حسن پرست۔۔۔۔۔“ ہم سب کہیں نا کہیں حسن پرست ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ”حسن“ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں۔۔۔۔۔ جو چیز خریدنے سے پہلے اس کی کوالٹی پرکھنے کے بجائے۔۔۔۔۔ اس کی ظاہری حالت دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ ”مرد۔۔۔۔۔“ حوس ہمیشہ خوبصورت عورت سے پوری کرتا ہے۔۔۔۔۔ اور تسخیر کرنے کی چاہ ہمیشہ منفرد عورت کو کرنے کی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس میں محبت کا فلسفہ کہیں بھی نہیں آتا۔۔۔۔۔ اگر

اور بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائی۔۔۔۔۔

ختم شد

اگر آپ بھی لکھنے کا ہنر جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر کو پلٹ فارم ملے تو کلاسک اردو میٹریل کارپوریشن آپ کو یہ موقع فراہم کر رہا ہے۔

آپ اپنی لکھی تحریر ہمیں اس ایڈریس پر میل کر سکتے ہیں

ClassicNovels04@Gmail.Com

اور اگر آپ بہت سارے ناولز پڑھنے کے شوقین ہیں تو کلاسک اردو میٹریل ویب سائٹ پر آپ کو ہر کیٹیگری کے بے شمار ناولز اعلیٰ کوالٹی پی ڈی ایف میں ملیں گے جنہیں آپ بنا کسی فضول ایڈ کے بہت آسان طریقے سے آرام سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ رہا ہماری ویب سائٹ کا لنک

[/https://classicurdumaterial.com](https://classicurdumaterial.com)

اس کے علاوہ اگر آپ کہانیاں پڑھنے سے زیادہ سننے کے شوقین ہیں یا آپ کے فرینڈز اور فیملی میں کوئی ایسا ہے جسے اردو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے مگر وہ ناولز کے شوقین ہیں تو ان کیلئے بھی کلاسک اردو میٹریل کے پاس ہے بہت زبردست پیشکش۔ آپ ہمارے یوٹیوب چینل "Classic Entertainment" کو سبسکرائب کر کے وہاں موجود ہر کیٹیگری کے لاتعداد اردو ناولز آڈیو بک کی صورت سن سکتے ہیں۔ یہ رہا ہمارے یوٹیوب چینل کا لنک

<https://youtube.com/channel/UCtawu1YjgdBbKh-so2FwQtA>

کلاسک اردو میٹریل کارپوریشن